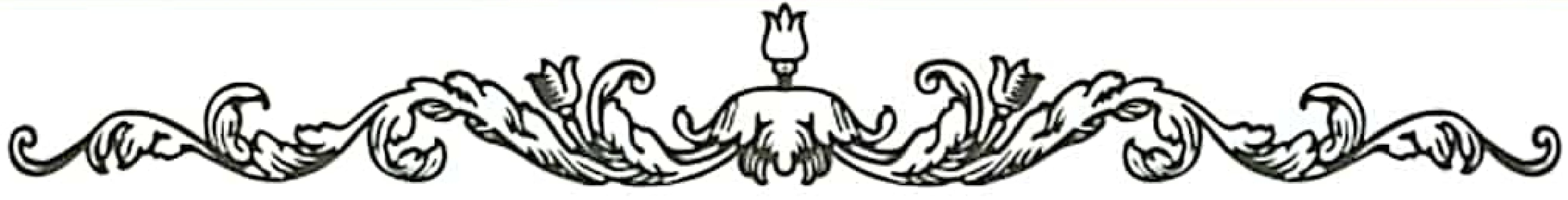
کلیاتِ جمال

جمال احسانی





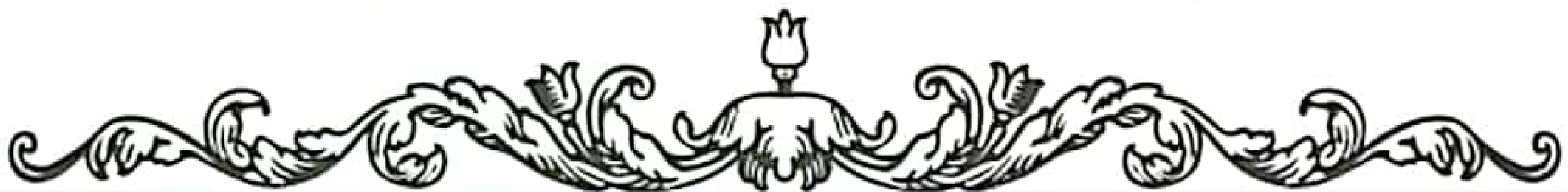
تمام کتب بغیر کسی مالی فائدے کے پی ڈی ایف میں
تبدیل کی جاتی ہیں۔
کتابی مواد کی ذمہ داری مصنف پر ہے۔

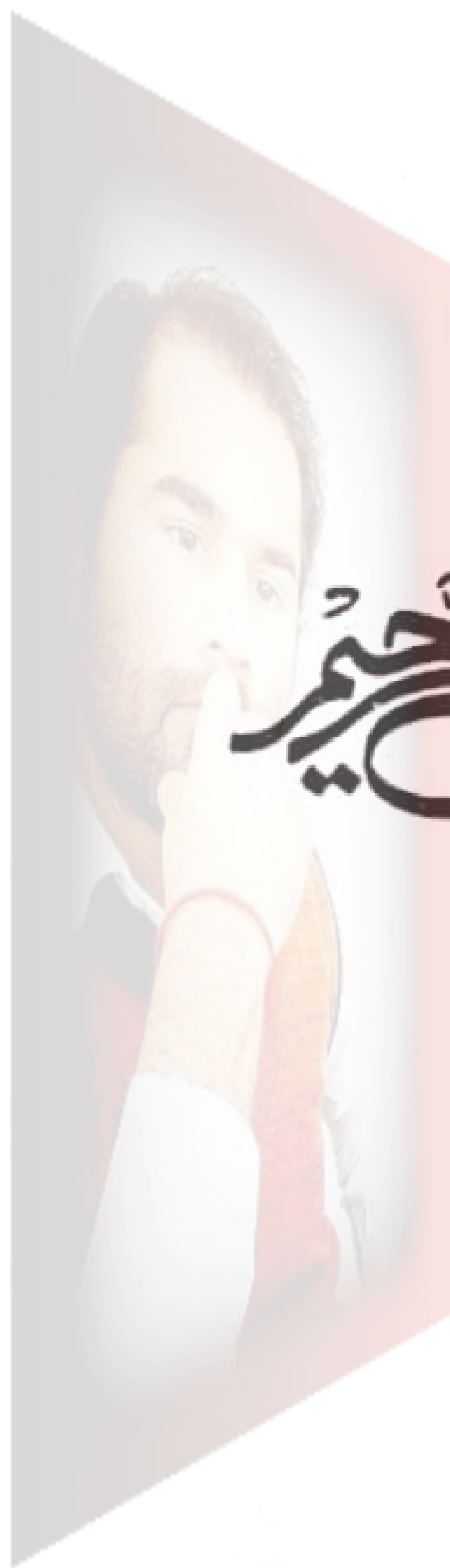
سید حسین احسن۔

ایڈمن۔ فیس بک گروپ

03448183736
03145951212

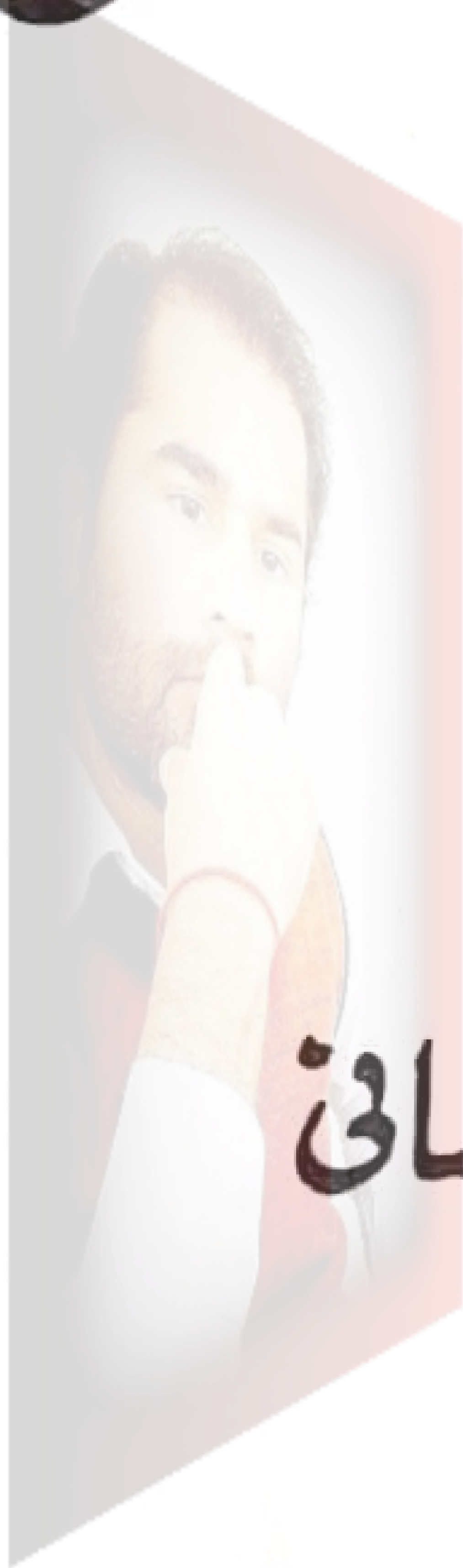






بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کلیاتِ جمال



جمال احسانی

دوست پبلی کیشنز

اسلام آباد۔ لاہور۔ کراچی



ضابطہ

ISBN: 978-969-496-304-4

کتاب : کلیاتِ جمال
شاعر : جمال احسانی
موسمِ اشاعت : 2008
تدوین : عقیل عباس جعفری
سرورق : خالد رشید
مطبع : ورڈ میٹ، اسلام آباد
قیمت : 380.00 روپے

دوست پبلی کیشنز پلاٹ 110، سٹریٹ 15، I-9/2، پوسٹ بکس نمبر 2958، اسلام آباد
فون: 051-4102784-5 E-mail: dostpub@comsats.net.pk

ترتیب





آتا ہے بہت یاد جمال احسانی
تھا خوب بھلا شخص دوبارہ نہ ملا

جمال احسانی: عہد حاضر کا اہم شاعر

جمال احسانی عہد حاضر کا بہت اہم شاعر دس سال قبل 10 فروری 1998ء کو ہم سے جدا ہو گیا۔ وہ ایک ایسا شاعر تھا جس کی شاعری کے نقوش کو دس برس کی گرد دھندلا نہ سکی۔ وقت ہی اچھے ادب اور ادیب کی قد و قامت ناپنے کا پیمانہ ہے۔ جمال احسانی کے دو مجموعے ''ستارہ سفر'' اور ''رات کے جاگے ہوئے'' اس کی زندگی میں شائع ہو گئے تھے جبکہ تیسرا مجموعہ ''تارے کو مہتاب کیا'' جمال نے اپنے آخری ایام میں اپنے ہی پیش لفظ کے ساتھ مرتب کر لیا تھا۔ یہ مجموعہ اس کے انتقال کے فوراً بعد شائع ہوا۔ اب اس کی کلیات آپ کے سامنے ہے۔ تین شعری مجموعوں نے جمال احسانی کو اس عہد کے منتخب شعراء کی صف میں اس طرح شامل کر دیا ہے کہ اس کی شاعری کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

جمال احسانی اپنے مشفقانہ رویے کی وجہ سے ہمارے خاندان میں عزیزوں کی طرح داخل تھا۔ ایک ہم عصر شاعر، کچھ عرصہ دفتر میں ساتھی اور پھر ایک بے حد مخلص دوست۔ اس کی یادوں کو سمیٹنا اور پھر شاعری پر لکھنا، ایک مختصر مضمون میں ممکن نہیں۔ وہ اپنی تیز روی اور متلون مزاجی کے ساتھ جن تجربات سے گزر گیا، ان میں اپنوں سے جدائی کا غم اور معاش کے ناہموار راستوں پر چلنے کی تھکن حاوی رہی۔ اپنے پیاروں کو وہ جو سکھ دینا چاہتا تھا، اس کے لئے سمجھوتوں کی ضرورت تھی اور یہ سمجھوتے کسی حساس شاعر کے لئے بہت مشکل ہیں۔ وہ محرومیاں جو اس نے خود جھیلی تھیں اور وہ اضطراب جو اس کی ذات میں تھا، ان کا کرب اس کے آخری مجموعہ میں پوری طرح محسوس کیا جا سکتا ہے۔ خصوصاً اس مجموعے کا دیباچہ ہمارے

معاشرے کیلئے ایک ایسا آئینہ ہے جس میں سچے فنکار کا عکس ریزہ ریزہ نظر آتا ہے۔ ایک اقتباس دیکھئے۔

> جب سے ہوش سنبھالا کسی ذاتی ٹھکانے میں نہ رہا۔ عمر عزیز کا اکثر و بیشتر حصہ کرائے کے مکانوں میں گزرا۔ لہٰذا مختلف مکانات کے مالکان کے بے جا ناز بھی اٹھانے پڑے۔ شاید ہی کوئی محلہ ایسا بچا ہو جہاں گزران نہیں ہوئی۔ کبھی مالک کو اپنے مکان کی ضرورت پڑی اور کبھی خود کوئی دوسرا سائبان خوش آ گیا۔

جمال کی شاعری میں کلاسیکی طرز اور جدید حسیت کا ایسا امتزاج ہے جو شعوری نہیں، اس کی وجہ اس کا اپنے عہد سے اور نئے لکھنے والوں سے وابستہ رہنے کے ساتھ ساتھ کلاسیکی شاعری کا گہرا مطالعہ تھا۔ جمال اساتذہ کی زمین پر بھی قدم رکھتا ہے تو اپنی شناخت نہیں کھوتا، اسے اپنی بات کہنے کا سلیقہ آتا تھا۔

چاہے جمال دوسرے ہی کی زمین ہو
ہم نے تو جب سنائی ہے اپنی سنائی بات

اسی غزل کے ایک شعر میں اس کی انفرادیت دیکھئے۔

اک بات تھی جو میں نے کہی تھی بہ صد نیاز
لیکن یہ میری بات میں کس نے ملائی بات

شاعری میں جمال احسانی کی فنی تربیت احسان امروہوی جیسے روایتی استاد کے زیر سایہ ہوئی تھی۔ بعد میں اسے سلیم احمد اور قمر جمیل کا قرب حاصل رہا۔ اس طرح جمال احسانی نے غزل کی صنف کو مکمل روایتی انداز میں اپنانے کے ساتھ ساتھ نئے عہد کی آگہی کو بھی ساتھ رکھا۔ جبھی تو بالکل ابتدائی دور میں اُس کے اِن اشعار نے قارئین کو اس کی طرف متوجہ کرایا تھا۔

ایک فقیر چلا جاتا ہے پکی سڑک پر گاؤں کی
آگے راہ کا سناٹا ہے پیچھے گونج کھڑاؤں کی

اُس رستے میں پیچھے سے اتنی آوازیں آئیں جمال
ایک جگہ تو گھوم کے رہ گئی ایڑھی سیدھے پاؤں کی

جمال احسانی کا پہلا مجموعہ ''ستارۂ سفر'' اس کے شعری مستقبل کے امکانات کا پتہ دینے کے ساتھ

قارئین کی توقعات کو بلند کر رہا تھا۔ اس مجموعے میں شامل متعدد اشعار مجموعہ میں شائع ہونے سے قبل مقبول ہو چکے تھے کہ جمال احسانی کی غزلیں مشاعروں، ادبی محفلوں میں بھرپور داد حاصل کرتی تھیں۔ اس مجموعے کی پہلی غزل کا مطلع اُس وقت بھی جمال کے تعارف میں پڑھا جاتا تھا اور آج بھی اس کی شاعری کا حوالہ بنتا ہے۔

چراغ سامنے والے مکان میں بھی نہ تھا
یہ سانحہ مرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا

یہ مجموعہ جب شائع ہوا، میں نے جمال پر ایک ہلکا پھلکا مضمون ''چھ گھنٹے'' کے عنوان سے پڑھا تھا اور اس کی جملہ بازیوں کا جواب دیتے ہوئے لکھا تھا کہ کچھ لوگ ''ستارۂ سفر'' کو نجوم کی کتاب سمجھ کر بھی خریدیں گے۔ جمال جو خود جملے لگانے میں ماہر تھا، دوسروں کے جملوں سے بھی لطف لیتا تھا۔ اس کی یہ شوخ طبعی پہلے مجموعے میں نمایاں ہے۔

یہ ہجر کون جانے، یہ بات کون سمجھے
میں اپنے گھر میں خوش ہوں وہ اپنے گھر میں خوش ہے

ooo

کچھ تو مشکل ہے بہت کارِ محبت اور کچھ
یار لوگوں سے مشقت نہیں کی جا سکتی

ooo

بہت ریا، بڑی عیاریوں کے بعد ہُوا
وہ مہربان دل آزاریوں کے بعد ہوا

اک آدمی کی رہائی سے بھی تو ہو جاتا
جو شہر بھر کی گرفتاریوں کے بعد ہوا

جمال کی شاعری میں ستارا، چراغ، رات، سفر، مہتاب ایسے استعارے ہیں جو بار بار استعمال ہوتے ہیں۔ میں نے جب اس کی کلیات میں یکجا تینوں مجموعوں پر نظر ڈالی تو مجھے جمال کی شاعری میں

رات کی اہمیت زیادہ نظر آئی۔ رات اپنے اثرات کی جتنی کیفیتوں سے متاثر کر سکتی ہے اس کی غزلوں میں موجود ہیں۔ ایک جاگنے والا احساس شاعر رات آتے ہی اپنے داخلی اور خارجی دونوں وجود کے ساتھ ایسے سفر پر نکلتا ہے جو اسے خواب بھی دکھاتے ہیں اور دشت نوردی کی تھکن سے بھی دو چار کرتے ہیں۔ ظاہر ہے ایسے سفر میں لا حاصلی ہی مقدر بنتی ہے۔

آنکھوں آنکھوں ہریالی کے خواب دکھائی دینے لگے
ہم ایسے کئی جاگنے والے نیند ہوئے صحراؤں کی

''ستارہ سفر'' سے دوسرے مجموعے ''رات کے جاگے ہوئے'' تک جمال جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھنے اور اسے تخلیق کا روپ دیتے ہوئے مطمئن نہیں ہوا۔ اس نے دوسرے مجموعے میں لکھا۔

دنیا جمال کچھ بھی کہے جانتا ہوں میں
سارا سفر ہے میرا غزل کی تلاش میں

وہ غزل جو ابھی لکھنی تھی وہ تا زندگی لکھتا رہا اور راتوں کو جاگ کر لکھتا رہا، اس کا مشاہدہ اب چراغ اور ستاروں سے بڑھ کے اپنے جیسے دوسروں کے کرب کو بھی اسی حصار میں لے آیا، جہاں وہ اپنی داخلیت کو آئینہ بنائے ہر عکس کو لفظوں میں تصویر کر رہا تھا۔ مشترک کرب کی سچائی اس مجموعے میں نمایاں ہے۔

منہ اندھیرے نظر آتے ہیں جو کچھ لوگ یہاں
یہ سحر خیز ہیں یا رات کے جاگے ہوئے ہیں

قہقہے بکھیرتا، جملے لگاتا، محفلوں کو گرماتا، خوش طبع جمال احسانی اس مجموعے میں اداس اور قدرے مایوس نظر آتا ہے۔ حالات پر نظر ڈالیں تو ایسا ہونا بہت فطری تھا۔ ابتدائی عمر کا تحیّر اور رجائیت اس وقت جدا ہونے لگتی ہے جب بار بار زندگی کے تلخ حقائق کا سامنا ہو۔ جاگتی آنکھوں کے خواب شکستہ ہو جاتے ہیں اور فضا مسموم نظر آتی ہے۔ اسی فضا میں سانس لینا اور خوبصورتی تلاش کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ تب مانوس استعارے اپنے وہ معنی بدل دیتے ہیں جو ابتدائی عمر کی خواب آگیں فضا میں لکھے تھے۔ جمال نے بھی دوسرے مجموعے میں ستارے کو سفر کا نشان نہیں بلکہ فلک سے بچھڑا اپنی طرح ہجر زدہ محسوس کیا ہے۔

اِک ستارا مجھ سے مل کر رو پڑا تھا کل جمال
وہ فلک سے اور میں تھا خاک سے بچھڑا ہوا

حقائق کی زد میں آتے ہی خواہشوں اور امکانات کا منظر بدل جاتا ہے۔

اِس کائنات خواہش و امکاں سے اُس طرف
منظر ہے ایک اور وہ منظر خراب ہے

آگاہ میں چراغ جلاتے ہی ہو گیا
دنیا مرے حساب سے بڑھ کر خراب ہے

جمال کی یاسیت نے اس کے لہجے کی تازگی کو متاثر نہیں کیا۔اس کی لفظیات اور تجربات کی رنگارنگی مشاہدے کی ہمہ جہتی آخری مجموعے ''تارے کو مہتاب کیا'' تک مسلسل موجود رہی۔

یہ آخری مجموعہ اس نے واقعی راتوں کو جاگ کر مرتب کیا۔کچھ اپنی شدید بیماری کی تکلیف کی بناء پر اور کچھ جاگنے کی عادت کی وجہ سے وہ ان دنوں بہت کم سوتا تھا۔عمر کے آخری ایام تک شعر لکھتا رہا۔

عادتِ شب بیداری بڑھتی جاتی ہے
جب سے گریہ و زاری بڑھتی جاتی ہے

اس مجموعے میں جمال کے ذاتی دکھ کو پوری طرح محسوس کیا جا سکتا ہے۔تخلیقی اضطراب بھی پوری طرح موجود ہے۔اس طرح کی یک رنگی اور بیانیہ جو غزلوں کو کمزور کر دیتا ہے۔اس کی شاعری میں نظر نہیں آتا۔اس کے لہجے کی توانائی کو بیماری اور نامساعد حالات نے بھی متاثر نہیں کیا بلکہ وہ تازگی اظہار جو پہلے مجموعے میں تھی آخر تک قائم رہی۔یہ شعر دیکھیں ۔

وہ اچھلا برف کے ٹکڑے کی طرح صرف ایک بار
پھر اس کے بعد مرے جام سے نہیں نکلا

جمال کی شعری طاقت اس کی سچائی ہے۔شاعری میں اس نے سمجھوتہ نہیں کیا۔نہ روایت کے زیر اثر آیا، نہ ترقی پسندی اور جدیدیت کو فیشن کے طور پر اپنایا۔جو لکھا، اپنا لکھا اور اچھا لکھا۔

کل رات میں شکستِ ستم گر سے خوش ہوا
وہ رو پڑا تو دل مرا اندر سے خوش ہوا

دریا تھا، چاند رات تھی اور اس کا ساتھ بھی
لیکن میں ایک اور ہی منظر سے خوش ہوا

رک سا گیا تھا آنکھ کی خشکی کے درمیاں
چھلکا تو میں بھی اپنے سمندر سے خوش ہوا

جمال نے شعری سفر کا آغاز ''ستارہ سفر'' سے کیا تھا اور پہلے ہی مجموعے نے پڑھنے والوں کو متوجہ کرلیا تھا۔ ''رات کے جاگے ہوئے'' اس کی اگلی منزل تھی جہاں معتبر ادیب وشعراء نے اسے خوش آمدید کہا تھا اور اچھی شاعری کے امکانات بھی ثابت ہوگئے تھے۔ جمال احسانی شاعری کی ان تمام توقعات پر پورا اترا، جبھی تو ''تارے کو مہتاب کیا'' جیسا مجموعہ زندگی ہی میں مرتب کرلیا۔ اس سفر میں شاعر جمال احسانی تخلیقی کامیابی سے تو ہمکنار ہوا مگر ذاتی زندگی میں بہت کچھ ہارتا چلا گیا۔ ناداری اور بیماری سچے شعروں کے عوض اس کی جھولی میں آ گرے۔ اس کی شاعری اسی سفر کی داستان ہے۔ اس درون ذات کا اظہار ہے جس کا محور صرف اور صرف شاعری تھی۔ اسے محبت تھی تو بس شاعری سے اور وہ ہمہ وقت اسی فضا میں رہنا چاہتا تھا۔ جیسا کہ جمال احسانی کے قریبی دوست اور ہم عصر شاعر سلیم کوثر نے لکھا ہے:

> جمال احسانی کا اور میرا ساتھ چھبیس برس پر محیط ماہ وسال کا دیدہ و نادیدہ ایسا منظر نامہ ہے جس میں بعض موڑ تو جان لیوا حد تک ڈرامائی ہیں۔ 100 کوارٹرز سے کلفٹن..... کلفٹن سے گلستان جوہر تک کے سفر میں اسے خسارہ ہوسکتا ہے کہ یہ سفر کہیں مادی اشیاء کے حصول اور کہیں نئے خوابوں کو تعبیر سے ہمکناری کا سفر ہے اور ان نئے خوابوں کو تعبیر کرنے کی آرزو میں اک شاعر کو زندگی کے نشیب وفراز کی دشواریوں میں کیسی تمثال گری کرنا پڑی، اس کا اندازہ اس کے چہرے پر چھائے ہوئے دھوپ چھاؤں کے دھند میں در آئی ہیں۔ ''تارے کو مہتاب کیا'' کی مسافت کا آغاز اس نے ''ستارۂ سفر'' سے کیا تھا ''رات کے جاگے ہوئے'' تو اگلی مسافت کے لیے ایک پڑاؤ تھا اور اب ''تارے کو مہتاب کیا'' تک آتے آتے جو مسافت جمال نے جھیلی ہے، اس میں اسے خسارہ بالکل نہیں ہوگا کہ یہ زندگی کی سچائیوں اور خیال کی اثر آفرینیوں کا سفر ہی نہیں،

درونِ ذات سجدہ گزاریوں کے عمل کی تہ داریوں کی داستان بھی ہے۔

محبت وہ لینڈ لارڈ ہے جو کرایہ دار نہیں رکھتی مستقل بود و باش چاہتی ہے۔ غزل اردو شاعری کی وہ آبرومندانہ روایت ہے جو غیر شاعر کو اپنی مملکت کی شہریت نہیں دیتی۔ ہر چند کہ بہت سے اہم لکھنے والوں کی گواہیوں اور ان کے تصدیق ناموں سے بے شمار شاعروں کو یہاں رہنے کا اقامہ مل گیا ہے مگر شہریت مرتے دم تک نہیں مل سکی اور یہ جو آج کل اُردو شاعری کا آنگن مچھلی بازار بنا ہوا ہے، تو یہ اس مملکت کے کھلے آسمان تلے ایسے بے شمار شاعروں کا سمٹا ہوا ہجوم اپنے تصدیق ناموں اور گواہیوں کے بینر اٹھائے اپنے شہری ہونے کا واویلا مچا رہا ہے۔ یہ ہجوم نہیں جانتا کہ محض شاعری کا لیبل لگانے سے شاعری کی روایت اپنی مملکت میں شہریت نہیں دیتی بلکہ وہ لکھنے والوں سے اور بہت سی باتوں کے علاوہ اپنے اندر اپنی ایک شاعرانہ بود و باش اور شاعرانہ روح کا مطالبہ کرتی ہے اور یوں وہ کہیں محسوساتی اور کہیں غیر محسوساتی طور پر انہیں قبول کرنے کو تیار نہیں اور مجھے خوشی ہے کہ جمال احسانی اردو غزل کی آبرومندانہ روایت کی مملکت کا نہ صرف شہری ہے بلکہ ایک آبرومند اور معزز شہری ہے۔

اس شہری کی دائمی ہجرت سے جمال کے قبیلے کو یقیناً نقصان پہنچا ہے مگر اس کی شاعری اپنے قدر و قیمت کی بناء پر محفوظ رہی ہے۔ اس نے نفع و نقصان سے بالاتر ہو کر وہ سچ لکھا ہے جو اپنی قدر نہیں کھو سکتا۔ اس نے لکھا ہے۔

اِک قرض ہے اُتار رہے ہیں کسی طرح
اِس عمر کو گزار رہے ہیں کسی طرح

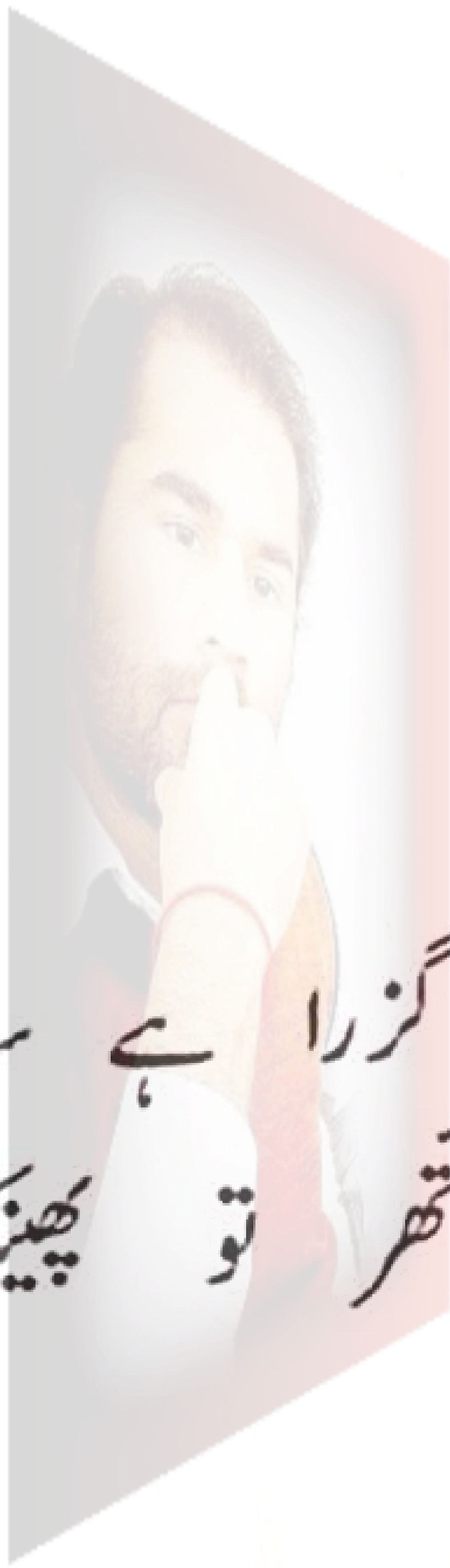
دنیا کو بھی کسی طرح نزدیک کر لیا
اور نفس کو بھی مار رہے ہیں کسی طرح

اپنے آخری دو اشعار میں اس نے اس دنیا سے رخصت کا اشارہ دے دیا تھا۔ رات کو جاگتے ہوئے کشف کا یہ لمحہ آخری سچا شعر دے گیا۔

تمام اسباب خاک و آب کو اب ڈھونڈنے والا ہے
ترا مہمان چند لمحوں میں رخصت ہونے والا ہے

فاطمہ حسن


الحمد لائبریری
فیس بک
گروپ۔
کتابیں
پڑھیے
ستارۂ سفر
Imagitor



مرے پڑوس میں گزرا ہے سانحہ کوئی
وگرنہ صحن میں پتھر تو پھینکتا کوئی

انتساب

اپنے بڑے بھائی

محمد بلال عثمانی کے نام



نہ اجنبی ہے کوئی اور نہ آشنا کوئی
اکیلے پن کی بھی ہوتی ہے اِنتہا کوئی

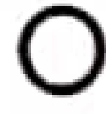
ترتیب











چراغ سامنے والے مکان میں بھی نہ تھا
یہ سانحہ مرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا

جو پہلے روز سے دو آنگنوں میں تھا حائل
وہ فاصلہ تو زمین آسمان میں بھی نہ تھا

یہ غم نہیں ہے کہ ہم دونوں ایک ہو نہ سکے
یہ رنج ہے کہ کوئی درمیان میں بھی نہ تھا

ہوا نہ جانے کہاں لے گئی وہ تیر کہ جو
نشانے پر بھی نہ تھا اور کمان میں بھی نہ تھا

جمالؔ پہلی شناسائی کا وہ اک لمحہ
اسے بھی یاد نہ تھا، میرے دھیان میں بھی نہ تھا

O

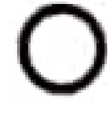
کبھی بُھلا کے، کبھی اُس کو یاد کر کے مجھے
جمالؔ قرض چُکانے ہیں عمر بھر کے مجھے

ابھی تو منزلِ جاناں سے کوسوں دُور ہوں مَیں
ابھی تو راستے ہیں یاد اپنے گھر کے مجھے

جو لکھتا پھرتا ہے دیوار و در پہ نام مِرا
بکھیر دے نہ کہیں حُرف حُرف کر کے مجھے

محبتوں کی بلندی پہ ہے یقیں، تو کوئی
گلے لگائے مِری سطح پر اُتر کے مجھے

چراغ بن کے جلا جس کے واسطے اِک عمر
چلا گیا وہ ہوا کے سپرد کر کے مجھے



تیری یاد اور تیرے دھیان میں گزری ہے
ساری زندگی ایک مکان میں گزری ہے

اس تاریک فضا میں میری ساری عمر
دیا جلانے کے امکان میں گزری ہے

اپنے لیے جو شام بچا کر رکھی تھی
وہ تُجھ سے عہدو پیمان میں گزری ہے

تُجھ سے اُکتا جانے کی اک ساعت بھی
تیرے عشق ہی کے دوران میں گزری ہے

دیواروں کا شوق جہاں تھا سب کو جمالؔ
عمر مِری اُس خاندان میں گزری ہے

○

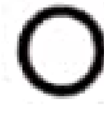
ایک فقیر چلا جاتا ہے پکّی سڑک پر گاؤں کی
آگے راہ کا سناٹا ہے پیچھے گونج کھڑاؤں کی

آنکھوں آنکھوں ہریالی کے خواب دکھائی دینے لگے
ہم ایسے کئی جاگنے والے نیند ہوئے صحراؤں کی

اپنے عکس کو چُھونے کی خواہش میں پرندہ ڈُوب گیا
پھر کبھی لَوٹ کر آئی نہیں دریا پر گھڑی دعاؤں کی

ڈار سے بچھڑا ہُوا کبوتر شاخ سے ٹوٹا ہُوا گلاب
آدھا دھوپ کا سرمایہ ہے آدھی دولت چھاؤں کی

اُس رستے میں پیچھے سے اتنی آوازیں آئیں جمالؔ
ایک جگہ تو گھوم کے رہ گئی ایڑی سیدھے پاؤں کی



خوشبو گلاب میں خوش، پتّا شجر میں خوش ہے
جو بھی ہے اپنے اپنے دیوار و دَر میں خوش ہے

پیروں پہ جو کھڑا ہے، یہ ہے زمین اُس کی
ہے آسمان اُس کا، جو بال و پَر میں خوش ہے

یہ ہجر کون جانے، یہ بات کون سمجھے
مَیں اپنے گھر میں خوش ہوں وہ اپنے گھر میں خوش ہے

تُو ہی بتا محبت، یہ بھی کوئی خوشی ہے
یہ دل مِرا اکیلا، اس شہر بھر میں خوش ہے

جتنے بھی ہیں مسافر سب کے اصول الگ ہیں
کوئی قیام میں اور کوئی سفر میں خوش ہے

○

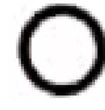
صُبح آتا ہوں یہاں اور شام ہو جانے کے بعد
لَوٹ جاتا ہوں میں گھر ناکام ہو جانے کے بعد

ڈھانپ دیتے ہیں ہوس کو عشق کی پوشاک میں
لوگ سارے شہر میں بدنام ہو جانے کے بعد

اِک ہجومِ یاد ہو گا اِن گلی کُوچوں کے بیچ
دیکھ شہرِ دل کی رونق شام ہو جانے کے بعد

یاد کرنے کے سِوا اَب کر بھی کیا سکتے ہیں ہم
بُھول جانے میں تجھے ناکام ہو جانے کے بعد

خود جسے محنت مشقّت سے بناتا ہوں جمالؔ
چھوڑ دیتا ہوں وہ رستہ عام ہو جانے کے بعد



عشق میں خود سے محبّت نہیں کی جا سکتی
پر کسی کو یہ نصیحت نہیں کی جا سکتی

کُنجیاں خانۂ ہمسایہ کی رکھتے کیوں ہو!
اپنے جب گھر کی حفاظت نہیں کی جا سکتی

کیسے وہ بستیاں آباد کریں گے، جن سے
دَرودیوار کی عزّت نہیں کی جا سکتی

کچھ تو مشکل ہے بہت کارِ محبّت اور کچھ
یار لوگوں سے مشقت نہیں کی جا سکتی

طائرِ یاد کو کم تھا شجرِ دل ورنہ
بے سبب ترکِ سکونت نہیں کی جا سکتی

اِک سفر میں کوئی دوبار نہیں لُٹ سکتا
اب دوبارہ تری چاہت نہیں کی جا سکتی

کوئی ہو بھی تو ذرا چاہنے والا تیرا
راہ چلتوں سے رقابت نہیں کی جا سکتی

آسماں پر بھی جہاں لوگ جھگڑتے ہوں جمالؔ
اس زمیں کے لیے ہجرت نہیں کی جا سکتی



نقش پا ڈھونڈتے ہو راہِ تمنّا میں کہاں
اس جگہ خاک کے ہونے کو غنیمت جانو

○

کب پاؤں فگار نہیں ہوتے کب سر میں دُھول نہیں ہوتی
تری راہ پہ چلنے والوں سے لیکن کبھی بھُول نہیں ہوتی

سرِ کوچۂ عشق آ پہنچے ہو لیکن ذرا دھیان رہے کہ یہاں
کوئی نیکی کام نہیں آتی کوئی دُعا قبول نہیں ہوتی

ہر چند اندیشۂ جاں ہے بہت لیکن اس کارِ محبت میں
کوئی پَل بیکار نہیں جاتا کوئی بات فضول نہیں ہوتی

ترے وصل کی آس بدلتے ہوئے ترے ہجر کی آگ میں جلتے ہوئے
کب دل مصروف نہیں رہتا کب جاں مشغول نہیں ہوتی

ہر رنگ جنُوں بھرنے والو شب بیداری کرنے والو!
ہے عشق وہ مزدوری جس میں محنت بھی وصول نہیں ہوتی

○

سمندروں کے درمیان سو گئے
تھکے ہوئے جہاز ران سو گئے

دریچہ ایک ہَولے ہَولے کُھل گیا
جب اُس گلی کے سب مکان سو گئے

سُلگتی دوپہر میں سب دُکان دار
کُھلی ہی چھوڑ کر دُکان سو گئے

پھر آج اِک ستارہ جاگتا رہا
پھر آج سات آسمان سو گئے

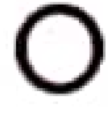
ہَوا چلی کُھلے سمندروں کے بیچ
تھکن سے چُور بادبان سو گئے

سحر ہوئی تو ریگ زار جاگ اُٹھا
مگر تمام ساربان سو گئے

اُس آنکھ کی پناہ اب نہیں نصیب
پلک پلک وہ سائبان سو گئے

جمالؔ آخر ایسی عادتیں بھی کیا
کہ گھر میں شام ہی سے آن سو گئے





ہے ایک عمر اور اس میں شریک سب میرے
مرے لیے بھی تو ہوتے یہ روز و شب میرے

خموش ہوں تو مجھے اتنا کم جواز نہ جان
مرے بیان سے باہر بھی ہیں سبب میرے

جو آسماں پہ ستارے دکھائی دیتے ہیں
یہ سارے پھول ہیں تیرے، یہ زخم سب میرے

کسی کے عکس سے بچھڑے تو پھر خبر نہ ہوئی
کہاں گئے وہ بھلا آئینے عجب میرے

وہ جس سفر پہ گیا ہے، اگر پلٹ آیا
گماں ہے کہ لے آئے گا چشم و لب میرے

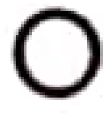
ہر آن بڑھتا ہی جاتا ہے رفتگاں کا ہجوم
ہَوا نے دیکھ لیے ہیں چراغ سب میرے

تھے بے شمار مگر شعر میں اِکائی ہوئے
جمالؔ زندگی کرنے کے سارے ڈھب میرے



نہ سوچتے تھے جو دیوار و دَر بدلنے تک
وہ لوگ ہو گئے تیّار گھر بدلنے تک

کمال اس نے کیا اور میں نے حد کر دی
کہ خود بدل گیا اس کی نظر بدلنے تک



کسی بھی دشت کسی بھی نگر چلا جاتا
میں اپنے ساتھ ہی رہتا جدھر چلا جاتا

وہ جس مُنڈیر پہ چھوڑ آیا اپنی آنکھیں، مَیں
چراغ ہوتا تو لَو بُھول کر چلا جاتا

اگر میں کھڑکیاں دوازے بند کر لیتا
تو گھر کا بھید سرِ رہ گزر چلا جاتا

مِرا مکاں مِری غفلت سے بچ گیا ورنہ
کوئی چُرا کے مرے بام و دَر چلا جاتا

تھکن بہت تھی مگر سایۂ شجر میں جمالؔ
میں بیٹھتا تو مِرا ہم سفر چلا جاتا

○

آنگن آنگن شمعِ خیالِ یار جلے
رات آئی اور لوگ ستارہ وار جلے

اس بستی کی رات بھی کتنی روشن ہے
بُجھ جائیں گر دیپ تو پہرے دار جلے

دن بھر گہرا سناٹا رہتا ہے مگر
شب بھر ایک چراغ پسِ دیوار جلے

کشتی سے یہ کس کا عکس اُتر آیا
ماہی گیر کے ہاتھوں میں پتوار جلے

مَیں تنہا ہر پیڑ سے مل کر روؤں جمالؔ
چاند اکیلا دریا کے اُس پار جلے

○

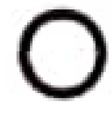
ہر ایک زخمِ شناسائی اِک کہانی ہے
ملے نہیں ہیں جو لوگ اُن کی مہربانی ہے

یہ حوصلہ تو تجھے جیت کر نصیب ہوا
وگرنہ ہار کے کس نے شکست مانی ہے

دِیے کی لَو سے جو تحریر میں نے لکھی تھی
ہوا کے پاس وہ اب تک مری نشانی ہے

سمندروں کا سفر آج تو مزا دے گا
ہوا بھی تیز ہے کشتی بھی بادبانی ہے

جمالؔ کھیل نہیں ہے کوئی غزل کہنا
کہ ایک بات بتانی ہے اِک چُھپانی ہے



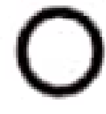
ایک قدم خشکی پر ہے اور دوسرانی پانی میں
ساری عمر بسر کر دی ہے نقلِ مکانی میں

آنسو بہتے ہیں اور دل یہ سوچ کے ڈرتا ہے
آنکھ کہیں کوئی بات نہ کہہ دے اس سے روانی میں

دو جیون تاراج ہوئے تب پوری ہوئی اِک بات
کیسا پُھول کِھلا ہے اور کیسی ویرانی میں

جب اُسے دیکھو آنکھ اور دل کو ساتھ ملا لینا
اِک آئینہ کم پڑ جائے گا حیرانی میں

راہ میں سارے چراغ اُسی کے دم سے روشن ہیں
جو پیمان ہَوا سے باندھا تھا نادانی میں



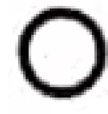
ستارے کا راز رکھ لیا مہمان مَیں نے
اِک اُجلے خواب اور آنکھ کے درمیان مَیں نے

چڑھا ہے جب چاند آسمان پر تو بوجھ اُترا
سُنا دی ہر سونے والے کو داستان مَیں نے

تمام تیشہ بدست حیرت میں گُم ہوئے ہیں
چراغ سے کاٹ دی ہوا کی چٹان مَیں نے

میں دھوپ میں کیوں کسی کا احسان مند ہوتا
خود اپنے سائے کو کر لیا سائبان مَیں نے

جمالؔ ہر شہر سے ہے وہ شہر پیارا مجھ کو
جہاں سے دیکھا تھا پہلی بار آسمان میں نے



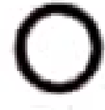
تُو مری کھوئی نشانی کے سِوا کچھ بھی نہیں
میں تری یاد دہانی کے سِوا کچھ بھی نہیں

بند کمروں میں مکیں سوتے ہیں اور آنگن میں
میرے اور رات کی رانی کے سِوا کچھ بھی نہیں

یہ تجھے ایک نظر دیکھنے والوں کا ہجوم
میری ناپختہ بیانی کے سِوا کچھ بھی نہیں

جو اُترتا ہے وہ بہتا ہی چلا جاتا ہے
گویا دریا میں روانی کے سِوا کچھ بھی نہیں

جتنے چہرے ہیں وہ مٹی کے بنائے ہوئے ہیں
جتنی آنکھیں ہیں وہ پانی کے سِوا کچھ بھی نہیں



بہت رِیا' بڑی عیّاریوں کے بعد ہُوا
وہ مہربان دِل آزاریوں کے بعد ہُوا

اِک آدمی کی رہائی سے بھی تو ہو جاتا
جو شہر بھر کی گرفتاریوں کے بعد ہُوا

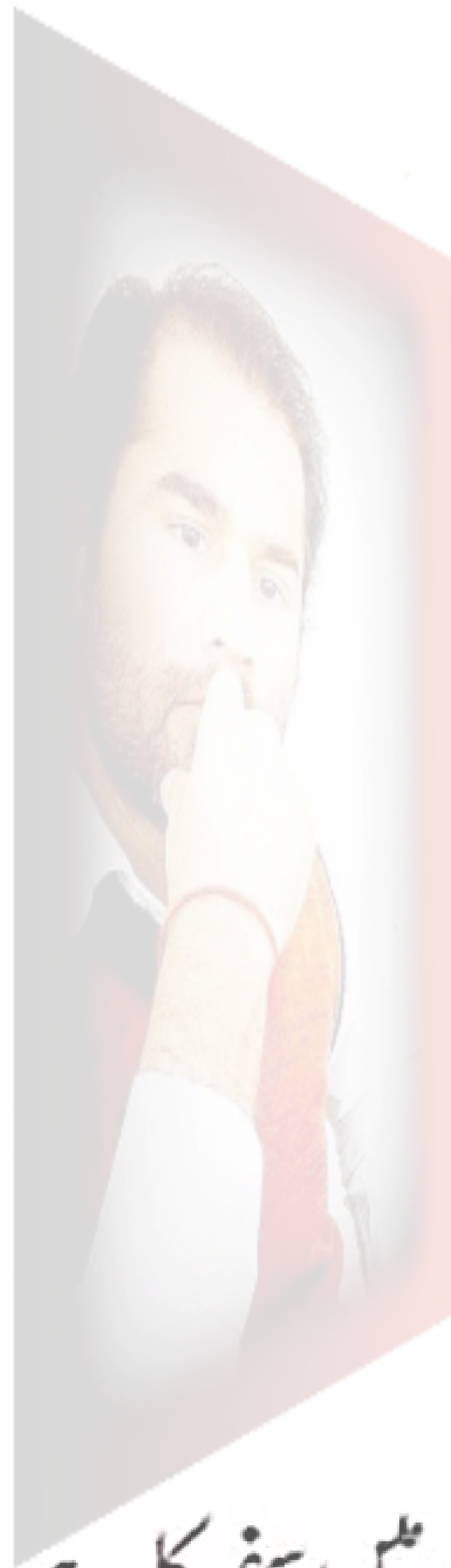
ہیں خوب لوگ جنہیں عشق کا مرض لاحق
ہزار طرح کی بیماریوں کے بعد ہُوا

ہمیں ہُوا ہے جو اندازہ زمیں و زماں
تری نِگہ کی فسوں کاریوں کے بعد ہوا

سفر تھا اور محبّت کا تھا سفر درپیش
سو فکر مند میں تیّاریوں کے بعد ہُوا

یہ ہم میں رنگِ حقیقت یونہی نہیں آیا
یہ رنگ پیدا اداکاریوں کے بعد ہُوا

تمام شہر جو دشمن بنا ہُوا ہے جمالؔ
اِک آدمی کی طرف داریوں کے بعد ہُوا



گھر بھی عزیز، شوق بھی دل میں سفر کا ہے
یہ روگ ایک پَل کا نہیں، عمر بھر کا ہے

گھر ہی کا راستہ ہے نہ یہ کُوئے یار کا
کہیئے جمالؔ آج اِرادہ کِدھر کا ہے

○

ہوا سے بات نہ کرتا ہوا نظر آیا
چراغِ شام بھی ڈرتا ہوا نظر آیا

ہر ایک شخص سمٹتا ہوا دکھائی دیا
تمام شہر بکھرتا ہوا نظر آیا

اُسی نے سب کو کیا ہے لہولہان کہ جو
کسی پہ وار نہ کرتا ہوا نظر آیا

کوئی تو بات ہے جو مجمعِ فراخ دِلاں
ذرا سی بات پہ مرتا ہوا نظر آیا

وہ ایک عمر کے بعد اِس طرح ملا کہ مجھے
نہ مانتا نہ مکرتا ہوا نظر آیا

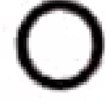
مجھے شکست دی میرے حریف نے پھر
مری شکست سے ڈرتا ہُوا نظر آیا

جمالؔ مجھ سے میرے خیر خواہ کہتے ہیں
میں اس غزل میں اترتا ہُوا نظر آیا



رونقِ شہر بھی صحرا کی فضا لگتی ہے
دل تو وہ بات کہے گا جو خدا لگتی ہے

چڑھتے سورج کی پرستش ہی پہ موقوف نہیں
صبح کے وقت تو ہر چیز خدا لگتی ہے



اِس طرف سے دیدہ تر اور ہے
دوسری جانب سمندر اور ہے

اِن دنوں شاداب ہے یہ دِل مگر
اس خرابے کا مقدّر اور ہے

دشت سے گُزرا تو دریا پر کُھلا
کوئی دریا سے بھی بڑھ کر اور ہے

چل ذرا اُس کو بھی جا کر دیکھ آئیں
اِک شجر اُس رہ گزر پر اور ہے

یہ بچھڑنے کا سماں سب کچھ نہیں
اِس سے آگے ایک منظر اور ہے

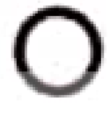
دل سے یادِ یار جاتی ہے تو کیا
ایک گھر اِس گھر سے باہر اور ہے

اک سفر صحرا سے گھر تک ہے جمالؔ
اِک مسافت گھر کے اندر اور ہے



چمک رہا ہے اُس گھر کی انگنائی پر
ایک ستارہ پَربت بھر اُونچائی پر

غیر یقینی صورتِ حال میں ملنے والے
بچھڑ گئے ہیں رستوں کی یکجائی پر



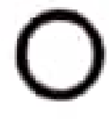
پہلے سُنا وہ صورت اب سرِ بام نہیں آتی
پھر یہ سُنا اُس کوچے میں اب شام نہیں آتی

اوّل تو اُس شہر سے کوئی ہوا نہیں آتی ہے
اور اگر آتی ہے تو مِرے نام نہیں آتی

اُسے محبّت کرنے کا فن مشکل لگتا ہے
ہمیں نبھانی رسمِ دُعا سلام نہیں آتی

بات بگڑنے پر آئے تو ایسے بِگڑ جاتی ہے
بعض اوقات تو ماں کی دُعا بھی کام نہیں آتی

میری باتیں اوروں سے وہ کرتا پھرتا ہے
میری ڈاک ہے لیکن میرے نام نہیں آتی



جب کبھی خواب کی اُمید بندھا کرتی ہے
نیند آنکھوں میں پریشان پھرا کرتی ہے

یاد رکھنا ہی محبت میں نہیں ہے سب کچھ
بُھول جانا بھی بڑی بات ہُوا کرتی ہے

دیکھ بے چارگیِ کوئے محبت کوئی دم
سائے کے واسطے دیوار دُعا کرتی ہے

صورتِ دل بڑے شہروں میں رہِ یک طرفہ
جانے والوں کو بہت یاد کیا کرتی ہے

دو اُجالوں کو ملاتی ہوئی اِک راہ گزار
بے چراغی کے بڑے رنج سہا کرتی ہے

○

جہاں جہاں پر دروازہ تھا وہاں دیوار ہوئی
کچھ تو فضائے کوچۂ جاناں اپنے لیے ہموار ہوئی

تیرے علاوہ کسے بتائیں سمجھے کون کہ تیرے بغیر
اور اِک رات آرام سے سوئے اور اِک رات اُدھار ہوئی

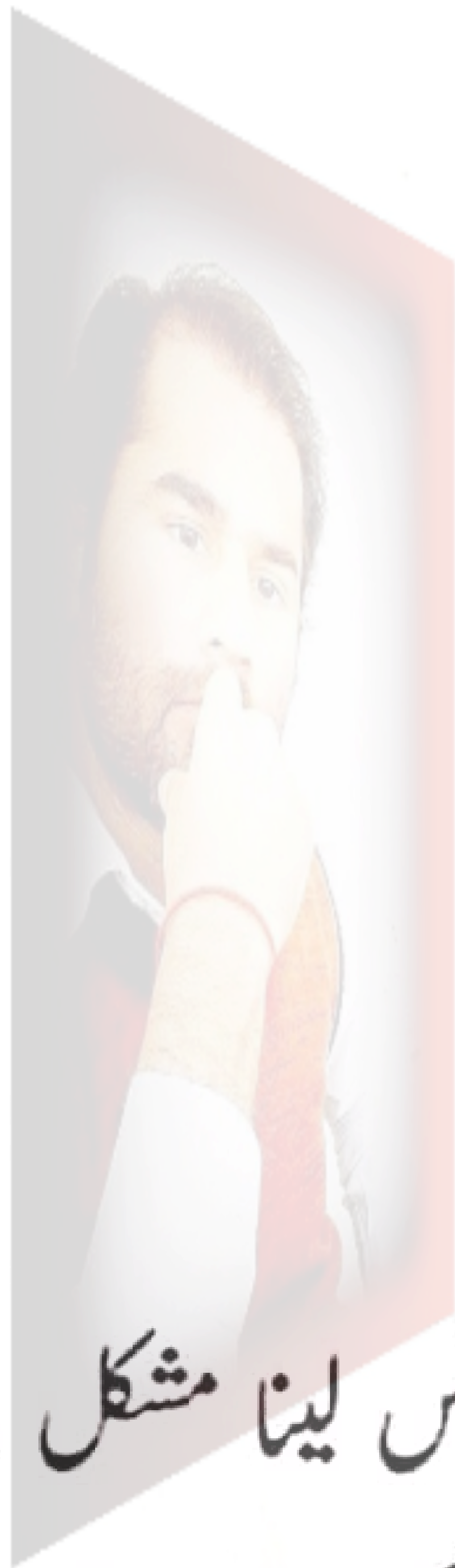
اِک کشتی کا بوجھ ہے گہری نیند سے بوجھل لہروں پر
دل میں دریا پار اُترنے کی خواہش بیدار ہوئی

آؤ مِل کے دُعائیں مانگیں اپنے کھیت اُجڑنے کی
اب کے گھر گھر آگ بٹے گی فصل اگر تیّار ہوئی

دیکھ عبادت گاہ کے دروازے پر بِھیڑ فقیروں کی
اتنا چلے اور ایک قدم کی مسافت اِن پر بار ہوئی

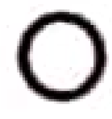
ان پودوں کو کس دریا کے پانی نے سیراب کیا
ایک ہی پُھول میں رنگ سے خوشبو سات سمندر پار ہوئی

آج نہ جانے کیا گزرے گی تنہا سونے والوں پر
اِک جاڑے کی رات اوپر سے بارش مُوسلا دھار ہوئی



کُھلی فضا میں بھی اب سانس لینا مشکل ہے
یہ واقعہ ہے ترے شہر کی ہَوا تھے ہم

ہماری روح کے صحرا سے کون گزرے گا
کِسے بتائیں، گئی بارشوں میں کیا تھے ہم



اپنی آنکھیں ترے چہرے پہ لگا کر دیکھوں
اور پھر اپنا بکھرتا ہوا منظر دیکھوں

نیند آئے تو کوئی گوشۂ تنہائی بہت
پاؤں پھیلانے کی حسرت ہو تو چادر دیکھوں

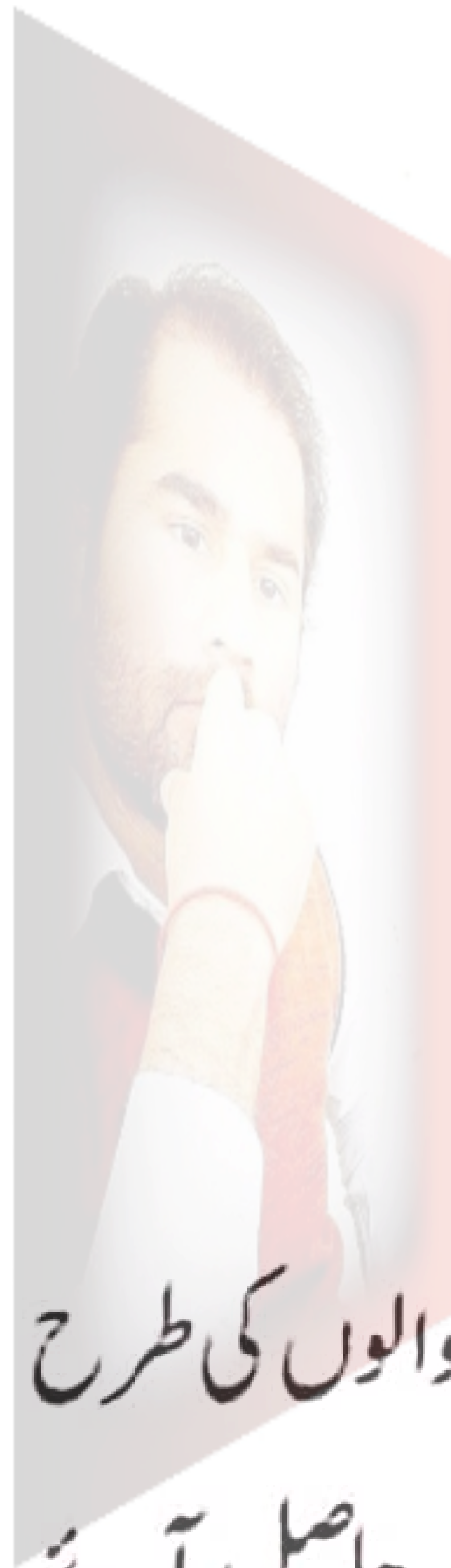
کتنی راتیں اسی خواہش میں بتائیں مَیں نے
چاند نکلے تو ذرا گھر سے نکل کر دیکھوں

پیش جب کر ہی چکا حرفِ عقیدت اُس کو
کیوں نہ اُس ہاتھ پہ ایمان بھی لا کر دیکھوں

عکس شاید ہے سلامت پسِ آئینۂ جاں
اپنی جانب کئی بڑھتے ہوئے لشکر دیکھوں

کون اِس تشنگیِ روح و بدن کو سمجھے
بیچ صحرا میں کھڑے ہو کے سندر دیکھوں

موسمِ سنگ زنی کی ہے خبر گرم جمالؔ
دست و بازو کبھی دیکھوں تو کبھی سرَ دیکھوں



کاش مَیں تجھ پہ ریاضی کے سوالوں کی طرح
خود کو تقسیم کروں، کچھ بھی نہ حاصل آئے

وہ ہمیں ڈھونڈنے کچھ دیر ہوئی نکلا ہے
یہ خبر ہم کو ملی جب سرِ منزل آئے

○

کچھ نہیں تیرے میرے میں
سب ہیں ایک اندھیرے میں

کون فلک پہ ٹہلتا ہے
ہلکے ہلکے سویرے میں

ایک چراغ ہوں مٹّی کا
دُور دراز اندھیرے میں

فکر کر اَگلے پڑاؤ کی
بیٹھ فقیر کے ڈیرے میں

بوجھ زیادہ اُٹھانا پڑے
شاید دوسرے پھیرے میں

آسمان پر روشن ہیں
سات ستارے گھیرے میں

چپکے سے کِھل اُٹھا ہے
ایک گلاب اندھیرے میں

مچھلی کا سب جھگڑا ہے
دریا اور مچھیرے میں



آنکھوں میں اشک نام کی شے تک نہیں رہی
جھیلیں بھی اب ترستی ہیں پانی کے واسطے

○

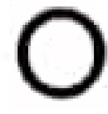
جو تُو گیا تھا تو تیرا خیال رہ جاتا
ہمارا کوئی تو پُرسانِ حال رہ جاتا

برا تھا یا وہ بھلا، لمحۂ محبت تھا
وہیں پہ سلسلۂ ماہ و سال رہ جاتا

بچھڑتے وقت ڈھلکتا نہ گر اُن آنکھوں سے
اُس ایک اشک کا کیا کیا ملال رہ جاتا

تمام آئینہ خانوں کی لاج رہ جاتی
کوئی بھی عکس اگر بے مثال رہ جاتا

گر امتحانِ جنوں میں نہ کرتے قیس کی نقل
جمالؔ سب سے ضروری سوال رہ جاتا



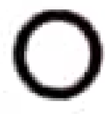
اس شہرِ کم قداں میں ہُنر آزمانا ہے
جب تک جمالؔ اپنا یہاں آب و دانا ہے

اِس لمحے تک ہے سارے مناظر کی تازگی
یہ لمحہ بیت جائے تو سب کچھ پُرانا ہے

بارش تو پھر لپیٹ میں لے لے گی شہر کو
بادل کو صرف ہاتھ ہَوا سے ملانا ہے

دیوار و دَر پہ دُھوپ چڑھی بیل کی طرح
کِن منزلوں کی سمت یہ لشکر روانہ ہے

ہونٹوں سے ہونٹ مِل گئے، دل سے ملا نہ دل
یہ بات بُھول جاؤ، اگر گھر چلانا ہے



نہ سننے میں، نہ کہیں دیکھنے میں آیا ہے
جو ہجر و وصل مِرے تجربے میں آیا ہے

نئے سرے سے جل اُٹھی ہے پھر پُرانی آگ
عجیب لُطف تجھے بُھولنے میں آیا ہے

نہ ہاتھ میرے، نہ آنکھیں مِری، نہ چہرہ مِرا
یہ کس کا عکس مِرے آئینے میں آیا ہے

جواز رکھتا ہے ہر ایک اپنے ہونے کا
یہاں پہ جو ہے، کسی سلسلے میں آیا ہے

ہے واقعہ ہَدفِ سیلِ آب تھا کوئی اور
مِرا مکان تو بس راستے میں آیا ہے

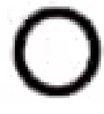
وہ رازِ وصل تھا جو نیند میں کُھلا مُجھ پر
یہ خوابِ ہجر ہے، جو جاگتے میں آیا ہے

جمالؔ دیکھ کے جیتا تھا جو کبھی تُجھ کو
کہیں وہ شخص بھی کیا دیکھنے میں آیا ہے



وہ آنکھ چپکے سے یوں دل کے بھید کہہ جائے
کہ جیسے بات کوئی یاد آ کے رہ جائے

نہ وہ حسین، نہ میں خوب رُو مگر اِک ساتھ
ہمیں جو دیکھ لے، وہ دیکھتا ہی رہ جائے



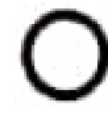
چشمِ حیراں کو تماشائے دِگر پر رکھا
اور اِس دل کو تری خیر خبر پر رکھا

عین ممکن ہے چراغوں کو وہ خاطر میں نہ لائے
گھر کا گھر ہم نے اُٹھا راہ گزر پر رکھا

بوجھ سے جھکنے لگی شاخ تو جا کر ہم نے
آشیانے کو کسی اور شجر پر رکھا

چمنِ دہر میں اِس طرح بسر کی ہم نے
سایۂ گُل کا بھی احسان نہ سَر پر رکھا

اس کی آواز پہ باہر نکل آیا ہوں جمالؔ
سارا اسبابِ سفر رہ گیا گھر پر رکھا



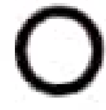
اتنے نڈھال راہ کے قہر و غضب سے تھے
منزل تک آ گئے تھے مگر جاں بہ لب سے تھے

بچھڑا تو اِک جہانِ تعلّق اُجڑ گیا
جس جس سے رابطے تھے' اُسی کے سبب سے تھے

مجھ جیسا تو کسی کا نہیں حال ہجر میں
گو اُس نظر کے وعدہ و پیمان سب سے تھے

مَیں نے ہی درگزر سے لیا کام مدّتوں
ورنہ ترے بچھڑنے کے اِمکان کب سے تھے

اپنا قصور یہ تھا کہ اُس شہر میں جمالؔ
زندہ تھے اور خیر سے نام و نسب سے تھے



سخن سے چاہے نہ رکھنا مطابقت کوئی
وہ آنکھ چُپ ہو تو پھر بولنا بھی مَت کوئی

اِس آب و خاک سے اِک ہاتھ کے بنائے ہوئے
وہ ہم ہیں جن میں نہیں ہے مشابہت کوئی

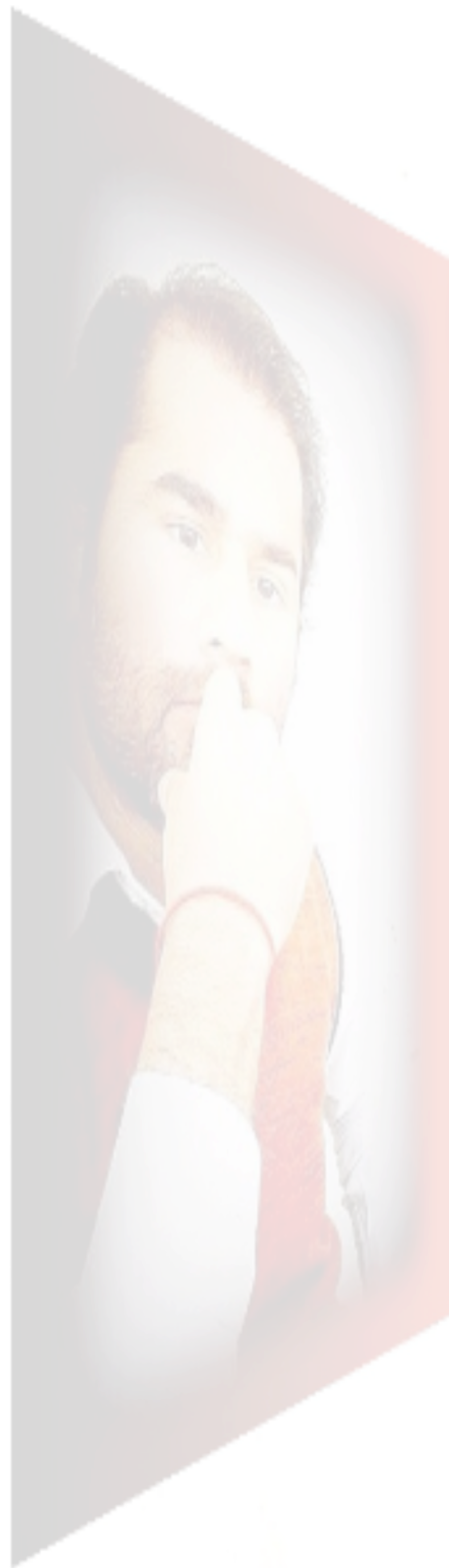
بچھڑ نہ جائیں دوبارہ جو مِل کے بیٹھے ہیں
چلا نہ دے کہیں پھر بادِ بے جہت کوئی

مَیں کیسے فرق کروں دوست اور دشمن میں
کہ مجھ سے کرتا ہے مجھ میں منافقت کوئی

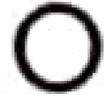
عجب تھی مجھ سے مِرے رنج کھینچنے کی اَدا
سو مجھ کو بخش گیا غم کی سلطنت کوئی

رہے گی اب یہ زمیں عمر بھر مدار بدر
کہ اب نہ آئے گا شاید فلک صفت کوئی

نہ خاکِ دشتِ تمنا ہوئے، نہ رونقِ شہر
پڑی تھی پاؤں میں زنجیرِ مصلحت کوئی



ہم نے پڑھی ہیں صاف صاف، ہم نے سُنی ہیں غور سے
نظریں کہ جو اُٹھیں نہیں، باتیں کہ جو ہوئیں نہیں



کبھی کبھار عجب وقت آن پڑتا ہے
نہ یاد پڑتا ہے، کوئی نہ دھیان پڑتا ہے

برہنگی ہے کچھ ایسی کہ جسم ڈھانپنے کو
زمیں کے واسطے کم آسمان پڑتا ہے

یہ جانتے ہوئے بھی، دھوپ میں قیام کیا
ذرا سے فاصلے پر سائبان پڑتا ہے

کسی زمانے میں منزل کے پاس ہوتا تھا
وہ سنگ میل جو اَب درمیان پڑتا ہے

نہ کم سمجھ سفرِ عمر یک نفس کو جمالؔ
اُس ایک راہ میں سارا جہان پڑتا ہے

○

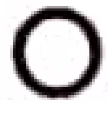
قرار دل کو سدا جس کے نام سے آیا
وہ آیا بھی تو کِسی اور کام سے آیا

کسی نے پوچھا نہیں لَوٹتے ہوئے مجھ سے
میں آج کیسے بھلا گھر میں شام سے آیا

ہم ایسے بے ہُنروں میں ہے جو سلیقۂ زیست
تیرے دیار میں پل بھر قیام سے آیا

جو آسماں کی بُلندی کو چُھونے والا تھا
وہی مِنارہ زمیں پر دھڑام سے آیا

مَیں خالی ہاتھ ہی جا پہنچا اُس کی محفل میں
مِرا رقیب بڑے انتظام سے آیا



کوئی پُرساں ہی نہ ہم دل زدگاں کا نکلا
شہر کا شہر اُسی دشمن جاں کا نکلا

نئی بستی میں سبھی لوگ پُرانے تھے مگر
ہم جہاں کے تھے کوئی بھی نہ وہاں کا نکلا

زیست خمیازۂ اِدراک ہے اور کچھ بھی نہیں
پسِ ہر سنگ اِک آئینہ زیاں کا نکلا

دل عبث آرزوئے خاک میں پہنچا تہِ آب
عکس کا سرِ و سرِ موجِ رواں کا نکلا

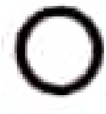
زینۂ ذات پہ دُز دانہ قدم رکھتا ہوا
قافلہ کس کے تعاقب میں گماں کا نکلا

چارہ سازوں میں تھی اِک چشمِ ندامت آثار
یہ مسیحاؤں میں بیمار کہاں کا نکلا

خس و خاشاکِ رہِ عشق ہوئے تو ہم سے
اور اِک رشتہ نسیمِ گزراں کا نکلا

تیرا انجام ہوا جو، وہی ہونا تھا جمالؔ
اِس جہاں میں تُو کسی اور جہاں کا نِکلا

اسے بچا لیا آوارگانِ شام نے آج
وگرنہ صبح کا بُھولا تو گھر چلا جاتا



کوئی بھی شکل ہو یا نام، کوئی یاد نہ تھا
عجیب شام تھی، اُس شام کوئی یاد نہ تھا

جنھیں پلٹنے کی فرصت نہیں رہی وہ لوگ
گھروں سے نکلے تھے تو کام کوئی یاد نہ تھا

ستارۂ سفرِ اپنے بچھڑنے والوں کو
پکارتا رہا گو نام کوئی یاد نہ تھا

تِری گلی ہی نہیں تیرے شہر تک کو بھی
ہم ایسا صاحبِ آرام کوئی یاد نہ تھا

متاعِ عمر ہوئی خرچ اور بتاتے ہوئے
نہ وہ دریچۂ نہ وہ بام کوئی یاد نہ تھا

○

جمالؔ شعر کوئی اَب کہا نہیں جاتا
کہے بغیر بھی لیکن رہا نہیں جاتا

ہوائے کوچۂ جاناں! یہ سَرد مہری کیا
کہ اب تو سانس بھی ہم سے لیا نہیں جاتا

وہ جس کے سائے میں جُھلسے ہیں جسم و روح سدا
اُسی درخت تلے بیٹھنا نہیں جاتا

کوئی چراغ سا جلتا ہے ساتھ کے گھر میں
کہ شب کو لوٹ کے جب تک مَیں آ نہیں جاتا

سفر شروع کیا ہے وہاں سے مَیں نے جمالؔ
جہاں سے آگے کوئی راستہ نہیں جاتا

○

عمر گزری جس کا رَستہ دیکھتے
آ بھی جاتا وہ تو ہم کیا دیکھتے

کیسے کیسے موڑ آئے راہ میں
ساتھ چلتے تو تماشا دیکھتے

قَریہ قَریہ جتنا آوارہ پھرے
گھر میں رہ لیتے تو دُنیا دیکھتے

گر بہا آتے نہ دریاؤں میں ہم
آج اُن آنکھوں سے صحرا دیکھتے

خود ہی رکھ آتے دِیا دیوار پر
اور پھر اس کا بھڑکنا دیکھتے

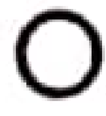
جب ہوئی تعمیرِ جسم و جاں تو لوگ
ہاتھ کا مٹی میں کھونا دیکھتے

دو قدم چل آتے اس کے ساتھ ساتھ
جس مسافر کو اکیلا دیکھتے

اعتبار اُٹھ جاتا آپس کا جمالؔ
لوگ اگر اُس کا بچھڑنا دیکھتے



یہ نظارہ دیکھنے میں آیا ہے اکثر پنگھٹ پر
پانی بھرنے آتے ہیں کتنے ہی سمندر پنگھٹ پر



جمالؔ اب تو یہی رہ گیا پتا اُس کا
بھلی سی شکل تھی، اچھا سا نام تھا اُس کا

پھر ایک سایہ در و بام پر اُتر آیا
دل و نگاہ میں پھر ذکر چھڑ گیا اُس کا

کِسے خبر تھی کہ یہ دن بھی دیکھنا ہو گا
اب اعتبار بھی دل کو نہیں رہا اُس کا

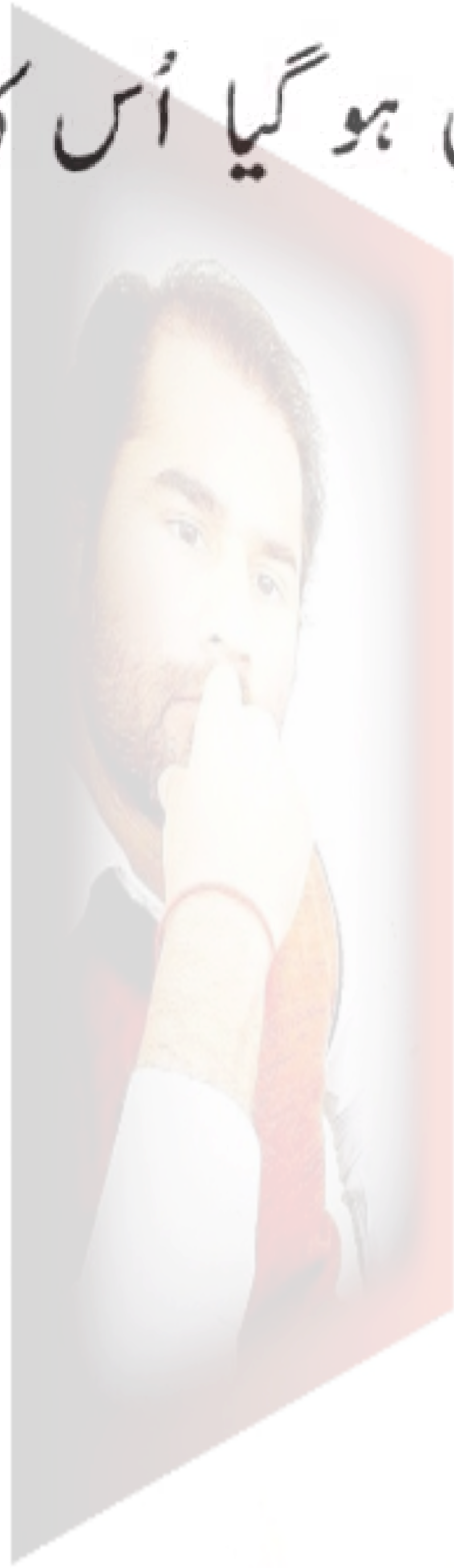
جو میرے ذکر پہ اب قہقہے لگاتا ہے
بچھڑتے وقت کوئی حال دیکھتا اُس کا

مجھے تباہ کیا اور سب کی نظروں میں
وہ بے قصور رہا، یہ کمال تھا اُس کا

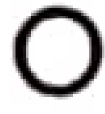
سو کس سے کیجئیے ذکر نزاکت خدوخال
کوئی مِلا ہی نہیں صورت آشنا اُس کا

جو سایہ سایہ شب و روز میرے ساتھ رہا
گلی گلی مَیں پتا پوچھتا پھرا اُس کا

جمالؔ اُس نے تو ٹھانی تھی عمر بھر کے لیے
یہ چار روز میں کیا حال ہو گیا اُس کا



یہ ٹھیک ہے ترا کردار بے مثال رہا
مگر فسانے کا مَیں مرکزی خیال رہا



سلوکِ ناروا کا اِس لیے شکوہ نہیں کرتا
کہ مَیں بھی تو کسی کی بات کی پروا نہیں کرتا

ترا اصرار سر آنکھوں پہ، تجھ کو بُھول جانے کی
مَیں کوشش کر کے دیکھوں گا مگر وعدہ نہیں کرتا

بہت ہُشیار ہوں، اپنی لڑائی آپ لڑتا ہوں،
میں دل کی بات کو دیوار پر لکھا نہیں کرتا

اگر پڑ جائے عادت آپ اپنے ساتھ رہنے کی
یہ ساتھ ایسا ہے کہ انسان کو تنہا نہیں کرتا

زمیں پَیروں سے کتنی بار اِک دن میں نکلتی ہے
مَیں ایسے حادثوں پر دل مگر چھوٹا نہیں کرتا

○

خورشیدِ وصال اُس کے اُجالے کے لیے ہے
اور ہجر کی شب میرے حوالے کے لیے ہے

اُس آنکھ میں اک رنگ ہے اور رنگِ ندامت
یہ ہار ہے اور ماننے والے کے لیے ہے

جو عُمر گزار آئے، گناہوں کے لیے تھی
باقی جو بچی ہے، وہ اِزالے کے لیے ہے

کچھ بھی نظر آتا نہیں تا حدِ نظر اَب
لیکن یہ سماں دیکھنے والے کے لیے ہے

پیراکیٔ دریائے زمانہ پہ مَت اِترا
وہ آنکھ کسی ڈوبنے والے کے لیے ہے

○

حسابِ عمر جب دینا پڑے گا
تو جمع و خرچ کا جھگڑا پڑے گا

ہمیں ہو گا خسارہ عمر بھر کا
تجھے سودا بہت مہنگا پڑے گا

بَنی جو صُلح کا باعث کسی دن،
اسی دیوار کا جھگڑا پڑے گا

قدم الٹے جہاں پڑنے لگیں گے
وہاں سے راستہ سیدھا پڑے گا

خرابہ ہی کوئی آباد کر لو
نہ جانے کب تلک رہنا پڑے گا

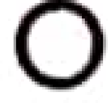
ہوا کا رُخ بدلنے کی طلب میں
ہوا کے ساتھ بھی چلنا پڑے گا

شجر بھی کاٹتے ہیں آنگنوں سے
پرندوں کا بھی دل رکھنا پڑے گا

برائے رونقِ بام و دریچہ
گھروں سے دُور بھی رہنا پڑے گا

مَیں اُٹھتا تھا تو کہتی تھی سرائے
مسافر شب یہیں رُکنا پڑے گا!

دوراہے پر کھڑے کب تک رہو گے
کوئی تو فیصلہ کرنا پڑے گا



اطہر نفیس کے نام......

ہے جس کے ہاتھ میں پتھر اُسے گماں بھی نہیں
کہ فکرِ آئینۂ جسم و جاں، یہاں بھی نہیں

جو بات تیری نظر میں ہے اور مرے دل میں
اگر زباں پہ نہ آئے تو رائگاں بھی نہیں

اَب اُس نے وقت نکالا ہے حال سُننے کو
بیان کرنے کو جب کوئی داستاں بھی نہیں

وہ دل سے سرسری گزرا، کرم کیا اُس نے
کہ رہنے کا متحمل تو یہ مکاں بھی نہیں

زمین پیروں سے نکلی تو یہ ہُوا معلوم
ہمارے سر پہ کئی دن سے آسماں بھی نہیں

سفر میں چلتے نہیں عام زندگی کے اُصول
وہ ہم قدم ہے مِرا جو مزاج داں بھی نہیں

نہیں پسند کوئی بے توجہی اُس کی
اور اپنے چاہنے والوں پہ مہرباں بھی نہیں

مِرے ہی گھر میں اندھیرا نہیں ہے صرف جمالؔ
کوئی چراغ فروزاں کسی کے ہاں بھی نہیں

نگاہ گُم تھی کسی خواب کے دُھندلکے میں
نظر کے سامنے منظر فرازِ بام کا تھا

○

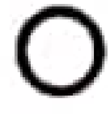
ہَوا بھی تُند موج کا بہاؤ بھی
کرے تو کیا کرے جمالؔ ناؤ بھی

کوئی تو معتبر گواہ رات کا
کسی کے نام کا دِیا جلاؤ بھی

یہاں پہ قافلے کے لُٹنے کا ہے ڈر
یہاں مگر ضروری ہے پڑاؤ بھی

پناہ دونوں لشکروں کو مِل گئی
عجاب تھا اُس پہاڑ کا کٹاؤ بھی

جکڑ کر اپنے بازوؤں میں یہ زمیں
ذرا اس آسمان کو گُھماؤ بھی



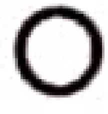
ہری بھری تھی ٹہنی سُرخ گلاب کی بھی
عجب کہانی تھی سُوکھے تالاب کی بھی

آنکھ میں ایک سفر ہے ریگستانوں کا
ایک مسافت دریاؤں کے خواب کی بھی

کُھلے رکھو دروازے اندھیری راتوں میں
کبھی ضرور آئے گی کرن مہتاب کی بھی

ہنستی گاتی آبادی کو اُجاڑنے میں
حالت غیر ہوئی ہوگی سیلاب کی بھی

کب تک آخر دل کی بات نہ کہتا جمالؔ
حد ہوتی ہے محفل کے آداب کی بھی



برس برس سے مجھے انتظار تھا جس کا
پلک جھپکنے سے پہلے وہ لمحہ بیت گیا

سحر تلک کوئی آیا نہ ساتھ کے گھر میں
برآمدے میں کوئی رات بھر ٹہلتا رہا

مَیں آنکھیں بند کیے جاگتا رہا شب بھر
کہ کوئی خواب کسی بُھولے بِسرے لمحے کا

پھر اُس کا نام ہے کیوں زینتِ در و دیوار
وہ ایک شخص جو اب تیرے شہر میں نہ رہا

دبے قدم اُتر آئی ہے رات پیڑوں پر
وہ سو کے اُٹھا کوئی جگنو آنکھ ملتا ہوا

قدم قدم پہ شکستوں کے باوجود بھی مَیں
سجائے پھرتا رہا' جال سا لکیروں کا

گراں گزرتا ہے بے حد یہ سانس کا اُلجھاؤ
ہمارے راستے میں اور فاصلے نہ بِچھا

فرار کے لیے دَر ہے نہ یاں دریچہ کوئی
نہ جانے کون سے رَستے میں اِس جگہ پہنچا

صدا بھی دے گا ملاقات کا تمنائی
کُھلا نہ چھوڑ کے بیٹھ اپنے گھر کا دروازہ

مِری بیاض سے کاٹے ہیں کس نے شعرِ جمال
یہ میرے بعد مرے گھر میں کون آیا تھا

○

سیلاب سے شہر اُجڑ رہا تھا
سارا نقشہ بگڑ رہا تھا

آندھی تھی کہ تھم نہیں رہی تھی
اِک بوڑھا درخت اُکھڑ رہا تھا

حل ہو گیا خون میں وہ آخر
جو وہم جڑیں پکڑ رہا تھا

گھر کے دَر و بام رو رہے تھے
مَیں پہلے پہل بچھڑ رہا تھا

تھا آئینہ رُو کوئی سرِ بام
دیوار پہ عکس پڑ رہا تھا

کچھ وہ بھی نڈھال تھا تھکن سے
کچھ میرا بھی سانس اُکھڑ رہا تھا

تھی ایسا ہُوا کہ زخمِ جاں کا
ٹانکا ٹانکا اُدھڑ رہا تھا



تمام رات دِیے پر دِیا جلاتی رہی
وہ سوئی سوئی ہوئی آنکھ نیند اُڑاتی رہی

نیا شریکِ سفر چاہتیں جتاتا رہا
جمالؔ پچھلی محبّت کی یاد آتی رہی

○

تمام راستوں میں خاک اُڑا چکا
جمالؔ اپنا رزق مَیں کما چکا

اَب اور کوئی کیفیّت ہو عشق میں
وصال و ہجر سے مَیں تنگ آ چکا

خُدا تجھے متاعِ عکس دے اگر
تو سب سے پہلے قرضِ آئینہ چکا

پتا تو خیر ٹھیک ہے مگر وہ شخص
زمانہ ہو گیا یہاں سے جا چکا

زمینِ ساحلِ سُخن ترے لیے
مَیں اپنی ساری کشتیاں جلا چکا

○

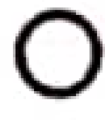
بہت دنوں سے دکھائی نہیں دیا وہ شخص
یہ تجھ سے پوچھتے ہوں گے تری گلی والے

بس ایک حرفِ متانت سے جل کے راکھ ہوئے
وہ میرے یار مرے قہقہوں کے متوالے

اگر وہ جان کے درپے ہیں اب تو کیا شکوہ
وہ لوگ تھے بھی بہت میرے چاہنے والے

مقدّروں کی لکیروں سے مات کھا ہی گئے
ہم ایک دوسرے کا ہاتھ چُومنے والے

اُسی مقام پہ کل مُجھ کو دیکھ کر تنہا
بہت اُداس ہوئے پھول بیچنے والے



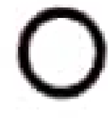
دِل پژمُردہ کو ہم رنگِ ابر و باد کر دے گا
وہ جب بھی آئے گا اِس شہر کو آباد کر دے گا

کوئی محرابِ دل ہو، طاقِ جاں ہو یا شبِ تیرہ
جہاں چاہے گا وہ روشن چراغِ یاد کر دے گا

وہ سارے رابطے توڑے گا ہم سے اور اچانک پھر
تعلّق کی نئی صورت کوئی ایجاد کر دے گا

گزر جائے گی یہ بھی شام پچھلی شام کے مانند
کہ مَیں کچھ عرض کر دوں گا وہ کچھ ارشاد کر دے گا

مَیں اس سے ملنے کیوں دل کو بھلا ہمراہ لے جاؤں
کہ یہ اِک عمر کی محنت مِری برباد کر دے گا



جمالؔ وعدۂ یک نانِ خشک پر رہنا
ہمارے واسطے آساں ہے عمر بھر رہنا

ہر ہانا جان کے پتھر تلک چُرا لیں گے
سفر میں جاگتے رہنا جدھر جدھر رہنا

کوئی بھی ہو اُسے لاتا ہے کم وہ خاطر میں
ہمیں بھی اپنی ہَوا میں زیادہ تر رہنا

کئی دنوں سے عجب حال ہو گیا اپنا
نہ اُس گلی ہی میں جانا نہ اپنے گھر رہنا

جمالؔ معرکۂ رزق ہو کہ عشق کی جنگ
مُجھ ایک شخص کو دونوں محاذ پر رہنا

○

ہر قرضِ سفر چکا دیا ہے
دشت اور نگر ملا دیا ہے

جُز عشق کِسے ملی یہ توفیق
جو پایا اُسے گنوا دیا ہے

پہلے ہی بہت تھا ہجر کا رنج
اب فاصلوں نے بڑھا دیا ہے

آبادیوں سے گئے ہُوؤں کو
صحراؤں نے حوصلہ دیا ہے

دیوار بدست راہ رَو تھے
کِس نے کِسے راستہ دیا ہے

بچھڑا تو تسلی دی ہے اُس نے
کِس دُھند میں آئینہ دیا ہے

مَیں بُجھ تو گیا ہوں پھر بھی مجھ میں
روشن ترے نام کا دیا ہے



عجیب لمحہ شامِ وصال تھا وہ بھی
مجھے بھی رنج تھا، افسردہ حال تھا وہ بھی

وہاں بھی ہنسنا ترے دل دُکھوں پہ لازم تھا
کہ سر بُلندیٔ غم کا سوال تھا وہ بھی

○

کیاری کیاری خالی ہے
گہری سوچ میں مالی ہے

رنگ ہے وہ اُڑنے والا
آنکھ وہ بُھولنے والی ہے

اُکتا کر تنہائی سے
اِک تصویر بنا لی ہے

ہاتھ ہَوا میں لہرائے
گاڑی جانے والی ہے

نا مانوس لب و لہجہ
صورت دیکھی بھالی ہے

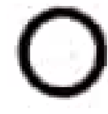
مائیں دروازوں پر ہیں
بارش ہونے والی ہے

کچھ نہیں اُس کی مُٹھی میں
میرا ہاتھ بھی خالی ہے

پھر افشا اک راز ہُوا
پھر اِک بات چُھپا لی ہے

لہرائی زخموں کی فصل
بدن بدن ہریالی ہے

اَب یہ بوڑھی دُنیا جمالؔ
آنکھ جھپکنے والی ہے



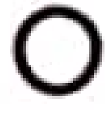
جو لمحۂ رائگاں گزرا وہی تو کام کا تھا
بہر نفس یہ زیاں عمرِ ناتمام کا تھا

یہ کیا ہُوا کہ بھرے آسماں کے آنگن سے
بچھڑ گیا' جو ستارہ ہمارے نام کا تھا

بڑھا کے اُس سے رہ و رسم اَب یہ سوچتے ہیں
وہی بہت تھا جو رشتہ دُعا سلام کا تھا

ہر اِک کے بس میں کہاں تھا کہ سو رہے سرِ شام
یہ کام بھی ترے آوارگانِ شام کا تھا

کوئی شجر' کوئی دیوار چاہتا تھا جمالؔ
سفر میں لوگ تھے' جھگڑا مگر قیام کا تھا



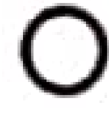
وہ ہاتھ اور ہی تھا وہ پتّھر ہی اور تھا
دیکھا پلک جھپک کے تو منظر ہی اور تھا

تیرے بغیر جس میں گزاری تھی ساری عمر
تجھ سے جب آئے مِل کے تو وہ گھر ہی اور تھا

سُنتا وہ کیا کہ خوف بظاہر تھا بے سبب
کہتا مَیں اُس سے کیا کہ مجھے ڈر ہی اور تھا

جاتی کہاں پہ بچ کے ہَوائے چراغ گیر
مجھ جیسا ایک میرے برابر ہی اور تھا

کیا ہوتے ہمکلام بھلا ساحل و چراغ
وہ شب ہی اور تھی وہ سمندر ہی اور تھا



تنہا بھی منہ اُٹھا کے نکلنا مُحال ہے
ہمراہ بھی ہجوم کے چلنا مُحال ہے

حرفِ دُعا کا صفحہ دستِ بلند پر
وہ بوجھ ہے کہ ہاتھ بدلنا مُحال ہے

دِل نے جلائی ہیں جو سرِ طاقِ انتظار
اُن موم بتیوں کا پگھلنا مُحال ہے

گُم کیا ہُوا ہے کاسۂ درویش اِک یہاں
نظریں اُٹھا کے شہر کا چلنا مُحال ہے

میرے بھی دستخط ہیں سرِ محضرِ شکست
میرے لیے بھی بچ کے نکلنا محال ہے

○

سب بدلتے جا رہے ہیں سر بسر اپنی جگہ
دشت اب اپنی جگہ باقی نہ گھر اپنی جگہ

نامساعد صورتِ حالات کے باوصف بھی
خود بنا لیتے ہیں جنگل میں شجر اپنی جگہ

مَیں بھی نادم ہوں کہ سب کے ساتھ چل سکتا نہیں
اور شرمندہ ہیں میرے ہم سفر اپنی جگہ

کیوں سمٹتی جا رہی ہیں خودبخود آبادیاں
چھوڑتے کیوں جا رہے ہیں بام و دَر اپنی جگہ

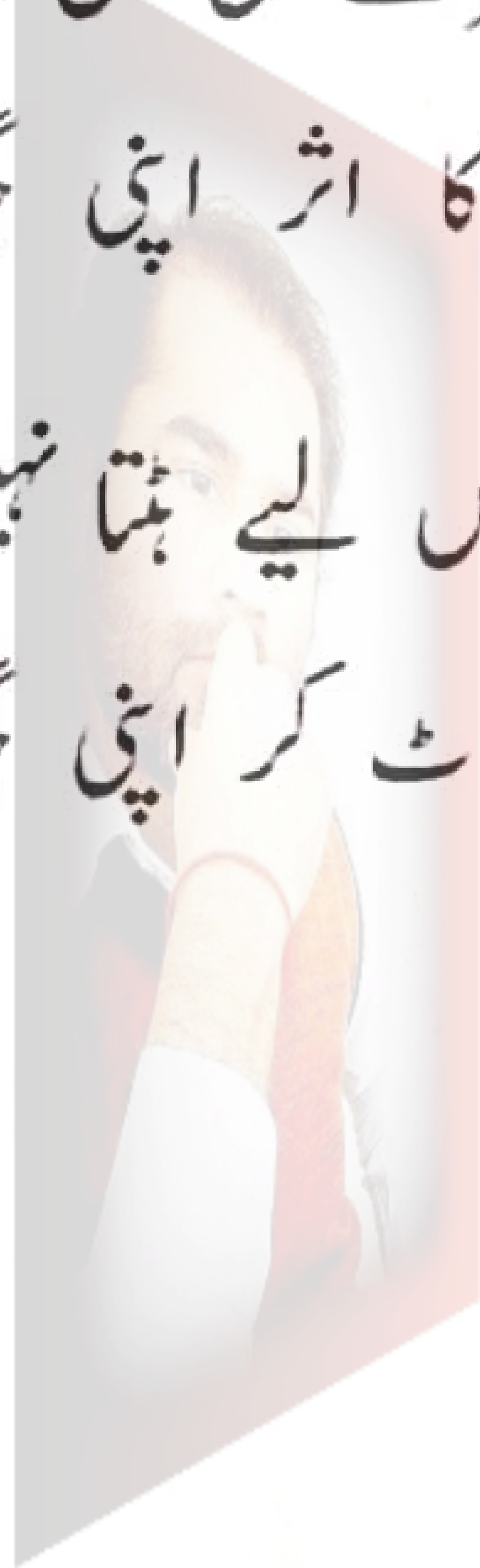
چاند کے ہمراہ وہ جلوہ نما ہے بام پر
اور قدموں کو پکڑتی رہ گزر اپنی جگہ

جو کچھ ان آنکھوں نے دیکھا ہے میں اس کا کیا کروں
شہر میں پھیلی ہوئی جھوٹی خبر اپنی جگہ

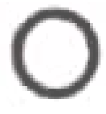
ایک اندیشہ تو اُس کی ہمرہی سے ہے مجھے
اور پھر اس کے بچھڑ جانے کا ڈر اپنی جگہ

اُس نگر سے کُوچ کرنا بھی مِرے بس میں نہیں
اِس نگر پر میرے دشمن کا اثر اپنی جگہ

مَیں جمالؔ اپنی جگہ سے اس لیے ہٹتا نہیں
وہ گھڑی آ جائے شاید لَوٹ کر اپنی جگہ



کبھی کسی صحرا میں کچھ دن کسی نگر میں رہتے ہیں
گھر کو دیکھ کے جیتے تھے سو روز سفر میں رہتے ہیں



عجب اندھیری رات کا نظارہ تھا — زمین آنکھ تھی فلک ستارہ تھا

وہ کون ہاتھ ہوگا جس نے پہلی بار — چراغ اونچے طاق سے اتارا تھا

جو صرف خشکیوں کے رہنے والے تھے — سمندر ان کا آخری سہارا تھا

میں پانیوں کے پہلے مرحلے تلک — جہاں پہ وہ تھا تیسرا کنارا تھا

جلی تھیں صرف چار چھ عمارتیں — لپیٹ میں اگرچہ شہر سارا تھا

وہی نگاہ جس نگاہ نے کبھی — مسافرت کے شوق کو ابھارا تھا

وہی چبوترا گلی کے موڑ پر — کبھی جہاں پہ قافلہ اتارا تھا

وہ لالٹین تھی کہ چوکیدار کے — نحیف ہاتھ میں کوئی ستارہ تھا

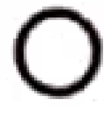
وہی مکان جس کے بام پر کبھی — اِک آئینے کا عکس بے سہارا تھا

وہی دریچہ جس کی چھاؤں میں کبھی — مَیں اپنی ساری کائنات ہارا تھا

وہی جگہ ہے جس جگہ تجھے کبھی ترے پرانے نام سے پکارا تھا
مگر کسے بتائیں کون مانے گا وہ خواب رات آنکھ میں دوبارہ تھا
پھر اِک سفر کے بعد دوسرا سفر یہ بات ماننے کا کس کو یارا تھا
پھر ایک عمر بیتنے کے باوجود
وہیں کھڑا تھا میں، وہی نظارہ تھا



جہاں مامور کرتا ہے خدا تخریب کاروں کو
وہاں دو چار وہ بستی بسانے والے رکھتا ہے



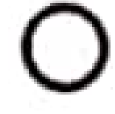
مَیں بُوندا باندی کے درمیان اپنے گھر کی چھت پر کھڑا رہا ہوں
چراغ تھا کوئی جس کے ہمراہ رات بھر بھیگتا رہا ہوں

یہ اَب کُھلا ہے کہ ان میں میرے نصیب کی ڈوریاں چُھپی تھیں
مَیں اُس کے ہاتھوں کی جن لکیروں کو مدّتوں چُومتا رہا ہوں

مَیں سُن چکا ہوں، ہواؤں اور بادلوں میں جو مشورے ہوئے ہیں
جو بارشیں اَب کے ہونے والی ہیں اُن کے قصّے سنا رہا ہوں

اُس ایک ویران پیڑ پر اَب کئی پرندوں کے گھونسلے ہیں
جو پچھلے موسم میں لکھ گیا تھا وہ نام مَیں ڈھونڈتا رہا ہوں

سفر کی لذّت سے بڑھ کے منزل کا قُرب تو معتبر نہیں ہے
وہ مِل گیا اور مَیں ابھی تک گلی گلی خاک اُڑا رہا ہوں



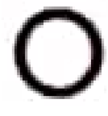
ہر اعتبارِ نمو خاک و آب سے اُٹھا
یہ کون سایۂ شاخِ گلاب سے اُٹھا

یہ دیکھ تجھ کو فراموش کر کے زندہ ہیں
نہ پوچھ، بوجھ یہ کتنے عذاب سے اُٹھا

بٹھا دیا گیا گورِ شکستہ کے مانند
یہاں جو آدمی بھی پیچ و تاب سے اُٹھا

خموش ہو گئے پہلے تو اُس کی بات پہ سب
پھر ایک شور سا میرے جواب سے اُٹھا

بہت مَیں رویا ہوں بے طاقتیِ چشم پہ رات
ترا خیال نہ جب میرے خواب سے اُٹھا



اُس کو تو جیت دیکھنا یا ہار دیکھنا
مجھ کو مگر لڑائی کا معیار دیکھنا

آوارگی کو چھوڑے زمانہ ہُوا مگر
آیا نہیں ابھی ہمیں گھر بار دیکھنا

خلوت میں آنکھ بھر کے جسے دیکھنا محال
ہر انجمن میں اُس کو لگاتار دیکھنا

لوگوں کو تیرے کوچے کی رونق پہ سوچنا
ہم کو ترے مکان کی دیوار دیکھنا

حبسِ خیال و فکر کے اِس دور میں جمالؔ
کیا گھر بنایا ہم نے ہَوا دار دیکھنا

○

ذرا سی بات پہ دل سے بگاڑ آیا ہوں
بنا بنایا ہوا گھر اُجاڑ آیا ہوں

وہ انتقام کی آتش تھی میرے سینے میں
ملا نہ کوئی تو خود کو پچھاڑ آیا ہوں

مَیں اِس جہان کی قسمت بدلنے نکلا تھا
اور اپنے ہاتھ کا لکھا ہی پھاڑ آیا ہوں

اَب اپنے دوسرے پھیرے کے انتظار میں ہوں
جہاں جہاں مِرے دشمن ہیں، تاڑ آیا ہوں

مَیں اُس گلی میں گیا اور دل و نگاہ سمیت
جمالؔ جیب میں جو کچھ تھا جھاڑ آیا ہوں

○

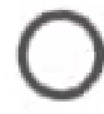
مَیں تنہا جان اور یہ صحرا تمام ہے
اَب اور کوئی دَم میں تماشا تمام ہے

دل پر کچھ ایسے زخم شناسائی ہیں کہ اَب
اُس آئینے میں عکسِ تمنّا تمام ہے

کب تک اے شامِ ہجر بہائیں گے اشکِ خُوں
اب رفتہ رفتہ یہ بھی خزانہ تمام ہے

دن کچھ بھی ہو، ترے ہی سبب سے ہے سُرخرو
شب کیا ہے، میری ذات کا جھگڑا تمام ہے

ہجر و وصال ہی پہ بھروسا نہ کر جمالؔ
دو چار گام جا کے یہ رستہ تمام ہے



بے وجہ اشک بہا کیوں ہے مٹی میں پھول کھلا کیوں ہے
سانس اُلجھ رہا ہے سینے میں آج اتنی تیز ہوا کیوں ہے
نیند اُتر رہی ہے پلکوں پر چاند اتنا تھکا تھکا کیوں ہے
اس رات کی نرم خموشی میں مجھے اپنا بھید دیا کیوں ہے
ہر موسم آ کر چلا گیا آنگن ویران پڑا کیوں ہے
اَب تُو نے نگاہیں پھیریں تو مجھے اتنا بُرا لگا کیوں ہے
کیا عشق بھی بھول گئے ہیں لوگ ہر قصہ نیا نیا کیوں ہے
ہر زخمِ جاں کے پیشِ نظر آئینہ رکھا ہوا کیوں ہے
سرِ لوحِ شہرِ غیر جمال
آخر مِرا نام لکھا کیوں ہے

○

عشق میں راہ سے جو لَوٹ کے گھر جاتا ہے
زندگی بھر کو پسِ کوچہ و دَر جاتا ہے

لوگ اس شہر کے اَب کم ہی دُعا مانگتے ہیں
چاند اِس شہر سے اب یوں ہی گزر جاتا ہے

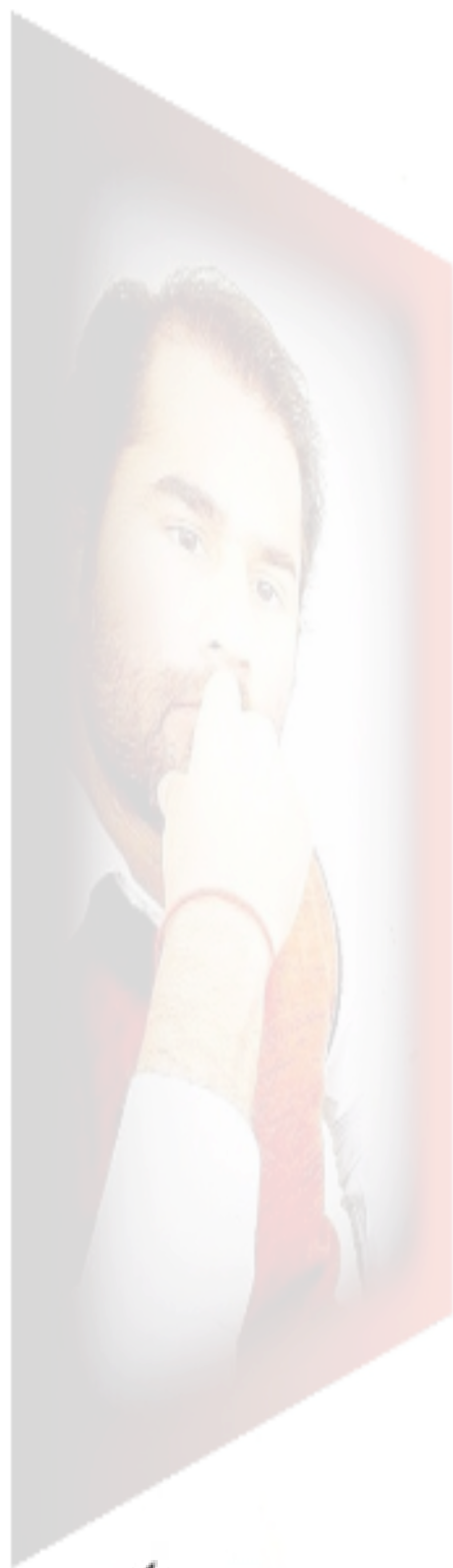
ہجر میں ایسے اندھیرے بھی نہ دیکھے کوئی
دل مُنڈیروں پہ دِیے دیکھ کے ڈر جاتا ہے

روز چڑھ جاتی ہے اِک اور پَرت سُورج پر
روز دیوار سے اِک سایہ اُتر جاتا ہے

کیسی نیندیں ہیں کہ بند آنکھوں جگاتی ہیں مجھے
کیسا سپنا ہے کہ ہر رات بکھر جاتا ہے

یوں گزرتا ہے بس اب دل سے ترے وصل کا دھیان
جیسے پردیس میں تہوار گزر جاتا ہے

کاسۂ رنج ہمیشہ رہا لبریز جمالؔ
آنکھ خالی ہو تو دل درد سے بھر جاتا ہے



مرے بھی اُجڑے ہوئے گھر کا حوصلہ نکلے

کہ بُھولا بھٹکا مسافر ہی کوئی آ نکلے

تُجھی پہ ٹوٹے نہیں ہیں اذیتوں کے پہاڑ
ہمیں بھی دیکھ کہ تجھ کو بُھلا دیا کیسا

○

دل بُھول کہیں نہ جائے سب کُچھ
یہ لمحۂ ہجر ہے عجب کُچھ

بے وجہ ہی آج رو لیے ہم
دل تھا بھی اُداس بے سبب کُچھ

میں کیا مرے ہجر و وصل کیا ہیں
اُس شخص ہی کا دیا ہے سب کُچھ

جلتی رہی شمعِ چشمِ جاناں
کہتا رہا عکسِ رنگِ لب کُچھ

اب آنکھ میں خواب تک نہیں ہیں
سیلاب میں بہہ گیا ہے سب کُچھ

○

ستارے ہی صرف راستوں میں نہ کھو رہے تھے
چراغ اور چاند بھی گلے مل کے رو رہے تھے

نِگاہ ایسے میں خاک پہچانتی کسی کو
غبار ایسا تھا آئینے عکس کھو رہے تھے

کسی بیاباں میں دُھوپ رستہ بھٹک گئی تھی
کسی بُھلاوے میں آ کے سب پیڑ سو رہے تھے

نہ رنجِ ہجرت تھا اور نہ شوقِ سفر تھا دل میں
سب اپنے اپنے گناہ کا بوجھ ڈھو رہے تھے

جمالؔ اُس وقت کوئی مجھ سے بچھڑ رہا تھا
زمین اور آسماں جب ایک ہو رہے تھے

○

رکھا ہے مال چشمِ خریدار سے الگ
دل نے دکان کھولی ہے بازار سے الگ

اُن کو ذرا سمجھنے کی کوشش تو کر، جو لوگ
بیٹھے ہیں تیرے سایۂ دیوار سے الگ

دل سے کسی بھی بات کا آنا زبان پر
اِک مرحلہ ہے کاوشِ اظہار سے الگ

سچا اگر ہو عشق تو رہتی ہے ساتھ ساتھ
اِک فکر، ہجر و وصل کے آزار سے الگ

ہم ایسے بے گھروں کو ہے درپیش اِن دنوں
اِک اور مسئلہ، ترے اقرار سے الگ

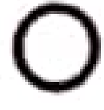
اپنا ہی دوش تھا کہ رہے غیر مطمئن
گھر بار سے الگ، نِگہٗ یار سے الگ

ایک اور بات اُس کی نگاہوں میں تھی جمال
ہونٹوں پہ بُھول جانے کے اصرار سے الگ



منزل پہ نِگاہ جم گئی ہے
چلنے کی سکت نہیں رہی ہے

سمجھے نہ سمجھنے دے ہے مُجھ کو
وہ کتنا عجیب آدمی ہے



اِک ندی مَوج در مَوج پہلو بدلتی رہی
اِک کشتی بڑے رکھ رکھاؤ سے چلتی رہی

اِک پرندہ ہوا آب و دانے کی خواہش میں گُم
ایک ٹہنی پہ دُکھ میں ہَوا ہاتھ ملتی رہی

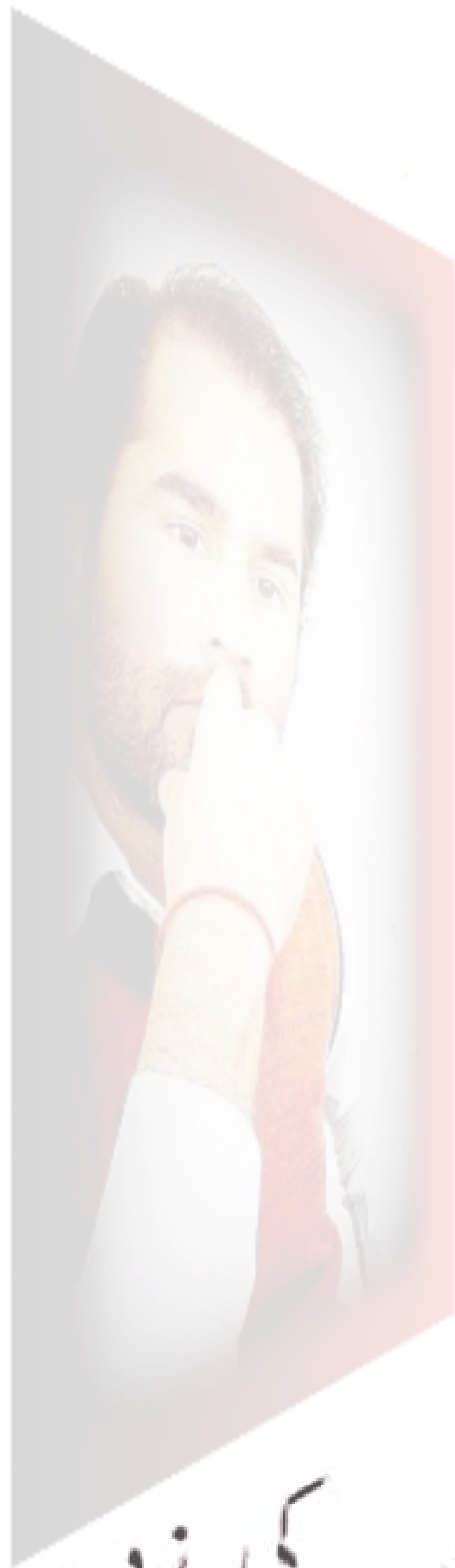
اِک ستارہ کہیں آسماں پر اُلجھتا رہا
ایک انگنائی میں رات بھر آگ جلتی رہی

اِک شجر شاخ سے شاخ کے فاصلوں پر جیا
ایک دیوار دو گھر بچھڑنے سے پلتی رہی

اِک صدا نے کئی جال صحراؤں پر بُن دیئے
ایک سرگوشی آبادیوں کو نگلتی رہی

اِک مسافت مکمل ہوئی نیند ہی نیند میں
ایک سپنے میں دن کی تھکن پنکھ جھلتی رہی

اِک دریچہ بلاتا رہا اپنی آغوش میں
ایک آوارگی گھر سے لے کر نکلتی رہی



اِک دیا سانس لیتا رہا دُھوپ کی زد پہ بھی
ایک پُھولوں کی بیل آندھیوں میں سنبھلتی رہی

اِک نئی دُنیا کے خواب آنکھوں نے دیکھے بہت
ایک اظہار کی سعی میں عمر ڈھلتی رہی



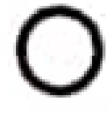
مَیں تنگ دست تھا ایسا گزارہ کیا کرتا
کرم وہ کر کے بھی مجھ پر دوبارہ کیا کرتا

وہ روز دن ڈھلے آتا نہ گر دریچے میں
تو چاند کیا کِیا کرتا' ستارہ کیا کرتا

کوئی بھی شخص اکیلا نہیں تھا ساحل پر
کسی کو ڈوبنے والا اشارہ کیا کرتا

گنوانے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا پاس مِرے
میں اُس گلی سے گزر کر دوبارہ کیا کرتا

مری زمیں نے گو اچھا نہیں کیا مِرے ساتھ
مَیں اپنی خاک سے لیکن کنارہ کیا کرتا



کوئی خدائی ہمیں دے نہ بادشاہت دے
جو دے سکے تو بس اُس کی گلی سے نسبت دے

ہمارا درد بجز اُس کے کون سمجھے گا
جو آنکھ ٹوٹے ہوئے آئینوں کو حیرت دے

زمین و آسماں اس کی گلی میں ایک سے ہیں
یہ اُس کی نگاہ کی مرضی ہے جس کو عزت دے

کبھی کسی کو شَرف بخش ہم کلامی کا
مجھے نہیں تو دَر و بام کو اجازت دے

بجا کہ گریۂ پیہم تجھے گوارا نہیں
پر اپنے ہجر زدوں کو تو کچھ رعایت دے

O

پرندے سرِ شاخ پیوند ہیں
شجر جنگلوں میں نظر بند ہیں

ہمیں لوگ ہوتے تھے آئینہ گر
ہمیں لوگ آئینہ پابند ہیں

جنھیں ہونا تھا میری پوشاک پر
مرے رزق پر سب وہ پیوند ہیں

کوئی شب میں رستہ سُجھاتا نہیں،
سروں پر ستارے بھی ہر چند ہیں

ہمیں بھی جمالؔ ایسی جلدی نہیں
کبھی تو کُھلیں گے جو دَر بند ہیں

○

پہلے پہل گھر سے نکلے ہو دھیان رہے
کچھ پردیس کی لکھنا گر اوسان رہے

لکھنے والے بُرا ہمیں ہی لکھیں گے
اپنے شہر میں ہم تیرے مہمان رہے

دل سے تیری یاد نکل کر جائے کیوں
گھر سے باہر کیوں گھر کا سامان رہے

دُور دراز سے آب و دانہ لانے والو
رستہ دیکھنے والوں کا بھی دھیان رہے

ایسا بدلا اپنا رنگ سمندر نے
کشتیاں کھینے والے تک حیران رہے

گہری نیندیں لانے والی ہوا چلی
ساری رات تری آہٹ پر کان رہے

دن میں جا کر ایک نشان لگا آؤں
کوئی تو رات کو اُس گھر کی پہچان رہے

زندہ رہ لینے کی حد تک رزق کماؤں
شعر لکھوں پھر جب تک جان میں جان رہے

دل ایسا آباد نگر ہے جس میں جمالؔ
گئے ہُوؤں کی یاد سدا مہمان رہے

○

وہ لوگ میرے بہت پیار کرنے والے تھے
گزر گئے ہیں جو موسم گزرنے والے تھے

نئی رُتوں میں دُکھوں کے بھی سلسلے ہیں نئے
وہ زخم تازہ ہوئے ہیں جو بھرنے والے تھے

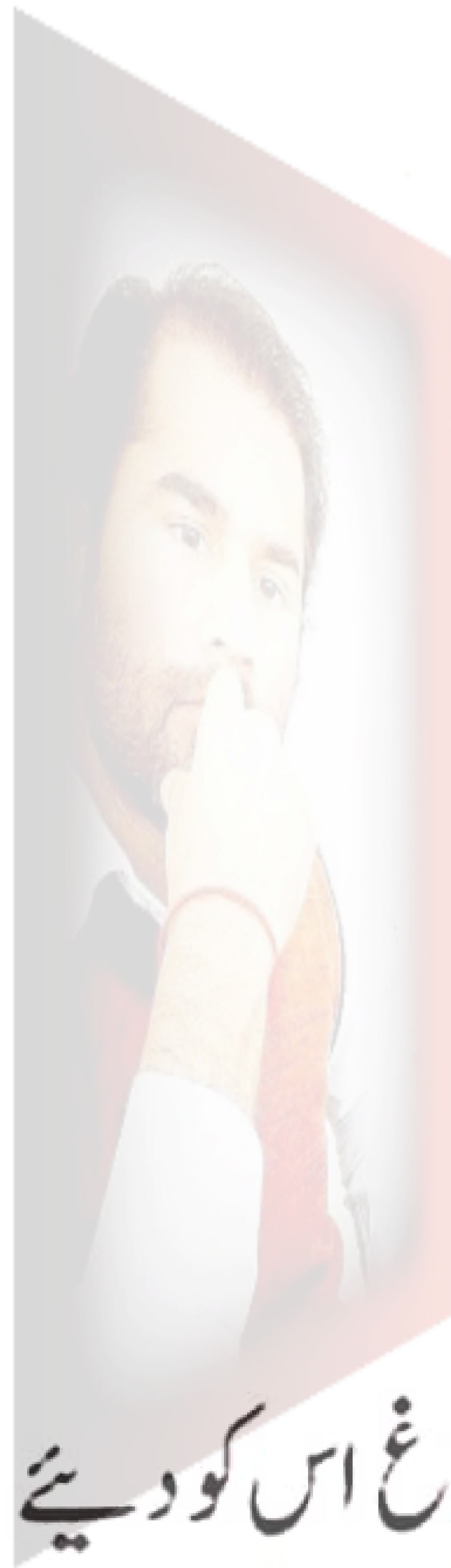
یہ کس مقام پہ سُوجھی تجھے بچھڑنے کی
کہ اَب تو جا کے کہیں دن سنورنے والے تھے

ہزار مجھ سے وہ پیمانِ وصل کرتا رہا
پر اُس کے طور طریقے مُکرنے والے تھے

تمہیں تو فخر تھا شیرازہ بندیِ جاں پر
ہمارا کیا ہے کہ ہم تو بکھرنے والے تھے

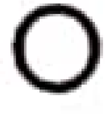
تمام رات نہایا تھا شہر بارش میں
وہ رنگ اُتر ہی گئے جو اُترنے والے تھے

اُس ایک چھوٹے سے قصبے پہ ریل ٹھہری نہیں
وہاں بھی چند مسافر اُترنے والے تھے



سر پر آئی ہوئی رات اور چراغ اس کو دیئے
بُھولے بھٹکے ہوئے رہگیر کا ڈر مجھ کو دیا

سبزۂ خاک سے عالم کو نوازا لیکن!
باغ ہے جو نہ بیابان، وہ گھر مجھ کو دیا



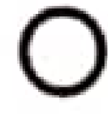
خرابۂ بام و در بہت یاد آ رہا ہے
نہ جانے کیوں آج گھر بہت یاد آ رہا ہے

بُھلا چکا ہوں جو راستہ طے کیا تھا مَیں نے
کِیا نہیں جو سفر بہت یاد آ رہا ہے

وہ ساتھ رہتا تھا گھر میں تو دھیان تک نہ آیا
مگر سرِ رہ گزر بہت یاد آ رہا ہے

اُداس بیٹھے ہیں گھر کی دیوار پر پرندے
جو صحن میں تھا شجر بہت یاد آ رہا ہے

لڑائی میں سارے وار خالی گئے تھے جس کے
جمالؔ وہ بے ہُنر بہت یاد آ رہا ہے



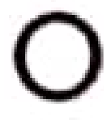
کس سے بارِ غم اُٹھا، کس نے کِسے رُسوا رکھا
بُھول جا یہ گزری باتیں ہیں اَب اِن میں کیا رکھا

ایک ایسا آمی اِس شہر میں موجود ہے
موت کے ڈر کے سوا جس نے مجھے زندہ رکھا

صرف جُھوٹے اعترافِ جُرم میں ہے بہتری
اب کے اُس نے میرے سر الزام ہی ایسا رکھا

مر گئے لیکن ترے آنے کی اُمیدیں رکھیں
بُجھ گئے لیکن چراغِ آرزو جلتا رکھا

جانے وہ جھونکا کِدھر سے آیا تھا جس نے جمالؔ
حَبس کے عالم میں بھی جی کو تروتازہ رکھا



کچھ بھی تو ہمیں حسبِ تمنّا نہ ملا
منزل تو بڑی بات ہے، رستہ نہ ملا

گھر بھر سے لڑائی کی سزا تھی کہ کوئی
دروازے تلک چھوڑنے والا نہ ملا

اب ٹوٹ کے چاہیں تو کسے چاہیں ہم
تُو جیسا ملا پھر کوئی ایسا نہ ملا

میں سب کو تو دُکھ درد سُنانے سے رہا
اک شخص ہے سو وہ کبھی تنہا نہ ملا

اِس شہر پہ کیا ٹوٹ پڑی ہے آفت
اندر سے کوئی شخص بھی زندہ نہ ملا

دیوار کے گرنے سے زیادہ ہے یہ رنج
ملبا جو ہٹایا ہے تو سایہ نہ ملا

آتا ہے بہت یاد جمالؔ احسانی
تھا خُوب بَھلا شخص دوبارہ نہ ملا



پھر اُس کے بعد ہر اِک لمحۂ سال ایسا تھا
ترے بچھڑنے کا دل کو ملال ایسا تھا

خموشی جُرم کا اقرار بننے والی تھی
جواب دینا پڑا وہ سوال ایسا تھا

○

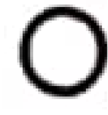
نہ دشت سے وہ مجھے اور نہ گھر سے یاد آیا
جو شخص ارادۂ ترکِ سفر سے یاد آیا

یہی فلک مری پرواز کے لیے کم تھا
مجھے شکستگیِ بال و پَر سے یاد آیا

ابھی تو رات بہت دیر تک رہے گی یہاں
چراغِ راہ کے بُجھنے کے ڈر سے یاد آیا

وہ ایک بُھولا ہُوا واقعہ اچانک آج
دلِ خراب کو جانے کدھر سے یاد آیا

ہم اپنی خانہ خرابی سے ہو گئے آباد
یہ دل کو آج تری چشمِ تَر سے یاد آیا



بکھر گیا ہے جو موتی پرونے والا تھا
وہ ہو رہا ہے یہاں جو نہ ہونے والا تھا

اور اَب یہ چاہتا ہوں، کوئی غم بٹائے مِرا
میں اپنی مٹی کبھی آپ ڈھونے والا تھا

ترے نہ آنے سے دِل بھی نہیں دُکھا شاید
وگرنہ کیا مَیں سرِ شام سونے والا تھا

ملا نہ تھا یہ بچھڑنے کا رنج تھا مُجھ کو
جلا نہیں تھا مگر راکھ ہونے والا تھا

ہزار طرح کے تھے رنج پچھلے موسم میں
پر اتنا تھا کہ کوئی ساتھ رونے والا تھا

○

بھرے گھر میں ہے میرا آشنا کون
بھلا مجھ سا ہے کوئی بے گھرا کون

اگر مَیں ہوں تو پھر تکرار کیسی
مِرے اندر ہے آخر دوسرا کون

سمندر کے اُدھر آنکھیں لگی ہیں
یہ ڈھیروں پانی آخر پی گیا کون

ندی کی لہریں اپنی مَوج میں ہیں
کنارے پر ہے یہ بیٹھا ہُوا کون

اکیلی شاخ کا دُکھ معتبر تھا
مگر پت جھڑ میں جُھولا جُھولتا کون

جب اُس کو جیتنا بھی ہار ٹھہرے
تو کھیلے زندگی بھر کا جُوا کون

گزرتی رات نے چُپ سادھ لی ہے
نہ جانے آتے آتے رُک گیا کون

سو ہم دونوں ہوئے ہیں ریزہ ریزہ
اِسی خواہش میں پہلے ٹُوٹتا کون

وصال و ہجر سے تھا ماورا عشق
مگر اِس زاویے سے دیکھتا کون

مُنڈیروں پہ اُتر آئے پرندے
یہ دروازے پہ دستک دے گیا کون

ہوئی تھی برف باری جس کی چھت پر
کل اُس کمرے میں جل کے مر گیا کون

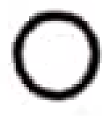
مری مٹھی میں جس کی خاک ہے بند
بھلا اُن بستیوں تک جا سکا کون

اُن آنکھوں میں چُھپے خوابیدہ جگنو
اندھیری رات میں روشن رہا کون

تنِ تنہا تھا اور لمبی سڑک تھی
مرے ہمراہ پر چلتا رہا کون



اُونچی عمارتوں کا مقدّر بنا گئیں
وہ بارشیں جو میرے گھروندے کو ڈھا گئیں



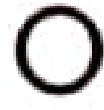
خموش رات میں کچھ یوں تجھے صدا دیں گے
کہ چاند کو بھی ترے ساتھ ہم جگا دیں گے

بھلا یہ تازہ رہ و رسم، خاک دے گی ہمیں
پُرانے یار کوئی زخم تو نیا دیں گے

اکیلے ہم پہ ہے رُسوائیوں کا بوجھ اتنا
کہ شاید اب تو ترا نام بھی بتا دیں گے

ہم اُس سے ترکِ تعلق کے بعد سوچتے ہیں
کِسے سلام کریں گے، کِسے دعا دیں گے

چلو سفر ہی کٹے گا، کچھ اپنا حال کہو
جو ہم پہ عشق میں بیتی ہے، ہم سُنا دیں گے



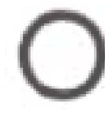
آج تو گھر میں کوئی نہیں ہے آج تو کُھل کے رو لیں گے
رو رو کر تھک جائیں گے پَل دو پَل کو سو لیں گے

کب تک ہم مشہور رہیں گے نیک اطوار و نیک خصال
کب تک یہ دیوار و دَر بھی آخر بھید نہ کھولیں گے

ہر دیوار گرا دیں گر اپنی جان میں جان رہی
ہاتھ اور پیر سلامت ہیں تو سارے پتھر ڈھو لیں گے

کھیتوں سے بادل تک اِک برسات کا فاصلہ حائل ہے
یعنی جب تک فصل کٹے گی ہم تو بوڑھے ہو لیں گے

رُوکھی سُوکھی کھا لیتے ہیں اِس اُمید کے ساتھ جمالؔ
بارش ہو جائے تو ہم بھی اپنی روٹی بھگو لیں گے

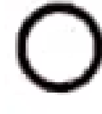


دیکھ کے بام پہ میرا چاند   آج کی رات نہ نکلا چاند
سب کی اپنی اپنی رات   سب کا اپنا اپنا چاند
شہر کی سُونی گلیوں میں   مَیں ہوں اور آوارہ چاند
دیکھنا چاہوں مَیں وہ آنکھ   جس نے پہلے دیکھا چاند
چُومنا چاہوں میں وہ ہاتھ   جن ہاتھوں نے بنایا چاند
ٹھنڈی روشنی پھیل گئی   نہر میں ڈوب کے نکلا چاند
دُور نظر سے ہوتا گیا   کیسے لمحہ لمحہ چاند
آنکھ مچولی کھیلنے کو   پھر چھت پر آ پہنچا چاند
سب فرصت کی باتیں ہیں   کب ڈوبا، کب نکلا چاند
پچھلی رات تھکن سے چُور   جھیل کنارے اُترا چاند

کل شب بازو پھیلائے تیرے شہر سے گزرا چاند
تجھ کو ڈھونڈنے میرے ساتھ بستی بستی گھوما چاند
چھوڑ رہا ہوں تیرا نگر روک رہا ہے رستہ چاند
وہ بھی تھا کیا وقت جمالؔ
کوئی کہا کرتا تھا چاند



کُوچے سے ترے نِکل رہا ہوں
مَیں صبح سویرے ڈھل رہا ہوں



ملنا نہیں تو یاد اُسے کرنا بھی چھوڑ دے
دیوار چھوڑ دی ہے تو سایہ بھی چھوڑ دے

اِک آدمی سے ترکِ مراسم کے بعد اب
کیا اِس گلی سے کوئی گزرنا بھی چھوڑ دے

آنا اب اُس نے چھوڑ دیا ہے اگر تو کیا
دل بے سبب چراغ جلانا بھی چھوڑ دے

مضبوط کشتیوں کو بچانے کے واسطے
دریا میں ایک ناؤ شکستہ بھی چھوڑ دے

اللہ کی زمین بڑی ہے بہت جمالؔ
عزّت نہیں جہاں، وہاں رہنا بھی چھوڑ دے

○

بیچ جنگل میں پہنچ کے کتنی حیرانی ہوئی
اِک صدا آئی اچانک جانی پہچانی ہوئی

پھر وہی چھت پر اکیلے ہم وہی ٹھنڈی ہَوا
کتنے اندیشے بڑھے جب رات طوفانی ہوئی

ہو گئی دُور اَن گِنت ویراں گزر گاہوں کی کوفت
ایک بستی سے گزرنے میں وہ آسانی ہوئی

اُس نے بارش میں بھی کھڑکی کھول کے دیکھا نہیں
بھیگنے والوں کو کل کیا کیا پریشانی ہوئی

گردِ رہ کے بیٹھتے ہی دیکھتا کیا ہوں جمالؔ
جانی پہچانی ہوئی ہر شکل انجانی ہوئی

○

مرے اندر کوئی مجھ سے جُدا ہے
مَیں چُپ ہو جاؤں تو وہ بولتا ہے

کسی کا حل کسی کا مسئلہ ہے
محبت اپنا اپنا تجربہ ہے

اگر سب آرزوئیں مر چکی ہیں
تو مجھ میں کون سانسیں لے رہا ہے

بدلتا ہی نہیں نظریں کبھی وہ
بہت اچھا ہے جو نا آشنا ہے

بہر گام آ رہی ہے ایک آہٹ
مسلسل کوئی پیچھا کر رہا ہے

دُکھوں نے رابطے قائم کیے ہیں
وگرنہ کون کس کو جانتا ہے

مِرا بھی چاہنے والا تھا کوئی!
وہ بچھڑا ہے تو اندازہ ہوا ہے

اب اسٹیشن پہ کس کو ڈھونڈتے ہو
جمالؔ احسانی کب کا جا چکا ہے

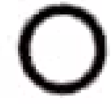


ہم اپنا لکھا ہوا کاٹ دیتے ہیں اکثر
ہمارا ٹھیک نہیں ہے کہ کب بدل جائیں

○

اُونچی نیچی پہاڑیوں پر کل دامنوں دامنوں بھرے بادل
اِس طرف برف سے ڈھکے خیمے اور دریا کے اُس طرف جنگل
آخری دُھول اُڑے گی آج یہاں ایک روز اور پیرہن نہ بدل
دوپہر بھر اُداس گلیوں میں ڈھونڈتی ہے کسے ہوا پاگل
پیڑ سے شاخچوں کا فاصلہ ہیں اگلے موسم میں آنے والے پھل
جسم وجاں سائے ہی میں جل جاتے آ گیا ہاتھ دُھوپ کا آنچل
گھوم آیا ہُوں پربتوں کے اُدھر ایک دن میرے ساتھ تُو بھی چل
حال کہہ کر مُکر گیا میں خُود تھم گیا بہتے بہتے وہ کاجل
موسمِ سرد اور ہَوا کی کاٹ خواہشِ انتظار ہو گئی شل

وہی مانوس شاہراہ جمال
اور اِک شکل کر گئی اوجھل



راتیں نیک خیالوں والی اور دن برکت والے
میری پونجی کب لوٹائے گا نیلی چھت والے

چاروں جانب رَچی ہوئی ہے اشکوں کی بُو باس
اِس رستے سے گزرے ہوں گے قافلے ہجرت والے

ایک کلی مہکائے ہوئے تھی پورا باغ کا باغ
اُس کی گلی کے سارے لوگ تھے اچھی عادت والے

حدِ نگاہ تلک پھیلا ہے اَن دیکھا آسیب
گوشۂ دل میں جھلمل جھلمل دیپ عبادت والے

پچھلی رات کے قہر سے پہلے کی ہے بات جمالؔ
اپنی جھولی میں تھے چند ستارے قسمت والے

○

مست ہیں لوگ سبھی حال دگر میں اپنے
گھر کی سی بات نہیں ہے کوئی گھر میں اپنے

اِک قدم ساتھ اُسے لے کے ہے چلنا مشکل
لوگ مِل جاتے ہیں ہر راہگزر میں اپنے

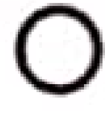
یہ جو ناکامیٔ منزل کی کسک ہے دل میں
کام آئے گی کہیں اور سفر میں اپنے

یہ اُسی آنکھ کا حصہ کہ ہم ایسوں کو
کم نگاہی پہ بھی رکھتی ہے اثر میں اپنے

کام آئی ہے بہت دربدری میں یہی بات
ٹِک کے بیٹھے جو نہیں ہم کبھی گھر میں اپنے

وہ کیاریوں کے انتخاب کیا ہوئے — مہکتے بولتے گلاب کیا ہوئے
یہ رات بھی وہی ہے صبح بھی وہی — وہ نیند کیا ہوئی، وہ خواب کیا ہوئے
چلو ورق ورق ہوئی کتابِ عشق — مگر جو یاد تھے وہ باب کیا ہوئے
وہ آنکھ ہے بہت شکایتیں لیے — مرے بچے تُلے جواب کیا ہوئے
کہاں گئے مِرے خلوص آشنا — وہ خال و خدِ ماہتاب کیا ہوئے
اُداس ہو گئے ہیں پنگھٹوں کے پُھول — وہ گاؤں نذرِ قحطِ آب کیا ہوئے
اکیلی سڑکیں رات بھر رہیں ملول — بھلا وہ خانماں خراب کیا ہوئے

جمالؔ زندگی کا ڈھنگ آ گیا
محبتوں میں بے حساب کیا ہوئے



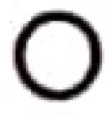
اس کی خواہش ہے کہ جلدی بُھول جانا چاہیے
بھول جانے کے لیے جس کو زمانہ چاہیے

اس کو آنا ہے مجھے وعدہ نبھانا چاہیے
گھر کے دروازے کو خود ہی کھٹکھٹانا چاہیے

کچی مٹی سے بنا تو لو مکاں، پر سوچ لو
بارشوں کو برسنے کا بہانہ چاہیے

دُھوپ سے بچ جاؤ گے پر چاندنی کھو جائے گی
سوچ کر آنگن میں کوئی پیڑ اُگانا چاہیے

لاکھ نظروں کو نئے رنگوں کا موسم ہو پسند
دل کو تو لیکن وہی ساتھی پُرانا چاہیے



سنگ کو تکیہ بنا، خاک کو چادر کر کے
جس جگہ تھکتا ہوں پڑ رہتا ہوں بستر کر کے

اب کسی آنکھ کا جادو نہیں چلتا مجھ پر
وہ نظر بھول گئی ہے مجھے پتھر کر کے

مہرباں اس کو نہ پایا تو پلٹ آئے ہم
ہاتھ کے ہاتھ حساب اپنا برابر کر کے

مجھ کو بھی پڑ گیا اِک اور ضروری کام
وہ بھی گھر پر نہ رہا وقت مقرّر کر کے

پوچھنا چاہتا ہوں مَیں یہ اُن آنکھوں سے جمالؔ
کس کو آباد کیا ہے، مجھے بے گھر کر کے

○

ہوں گرفتار خیر خواہوں میں
غیر محفوظ ہوں پناہوں میں

اپنے گھر میں رہوں کہ راہوں میں
ہوں اُسی آنکھ کی پناہوں میں

ڈھونڈتا ہوں وہ وصل کا لمحہ
خاک اُڑاتا ہوں سیر گاہوں میں

ہم فقیروں سے دوستی کر کے
کر شمار اپنا بادشاہوں میں

ماؤں جیسا خلوص ہوتا ہے
شہر کی سُونی شاہراہوں میں

○

مَیں خود تاریخ خود ہی فیصلہ ہوں
سو اپنے آپ کو دُہرا رہا ہوں

ذرا اس کرب کا اندازہ کیجئے
میں اپنے آپ کو پہچانتا ہوں

یقیناً اب وہ آیا چاہتا ہے
پرندوں کی صدائیں سُن رہا ہوں

بھلا کب تک کسی کی راہ دیکھوں
خود اپنے گھر پر دستک دے رہا ہوں

سرِ شام آ رہی ہے نیند مجھ کو
مَیں شاید آج اُسے یاد آ رہا ہوں

○

اک لہر ہے بوجھ ہزاروں پر
ہے دریا آج بہاروں پر

دن ڈھلنے لگا تو کشتیوں کی
لگنے لگی بھیڑ کناروں پر

یہ چاند ہے یا کوئی بھول گیا
مٹی کا چراغ ستاروں پر

اک بادل ساتھ ہے بچوں کے
اک دھوپ سجی ہے غباروں پر

ہے خواہش دور نکلنے کی
ان دیکھی راہ گزاروں پر

○

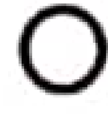
ایسے میں روشنی کا تمنائی کیا کرے
ہر سمت تیرگی ہو تو بینائی کیا کرے

آنسو نہیں رہے ہیں تو آنکھوں سے فائدہ
پانی نہیں تو جھیل کی گہرائی کیا کرے

بیٹھا تو ہے خموش وہ نیچی نظر کیے
اس سے زیادہ حوصلہ افزائی کیا کرے

سمجھے نہ کوئی بات تو سمجھاؤں کس طرح
بہرے ہوں سب تو قوّتِ گویائی کیا کرے

پہچان تو لیا ہے جمالؔ اُس نے دیکھ کر
اور اب ادا وہ حقِ شناسائی کیا کرے



ہر اِک چراغِ طاقِ جاں اِمشب اُتارا جائے گا
جو اس فضا میں گھر سے نکلے گا وہ مارا جائے گا

اس بار بھی برباد کر دیں گے کھڑی فصلوں کو ہم
اس بار بھی موسم کے سر الزام سارا جائے گا

آنکھیں اگر مُوندیں تو جانے آسماں پر کیا بنے
مُٹھی اگر کھولی تو ہاتھوں سے ستارہ جائے گا

جِھیلیں جہاں کے رہنے والوں نے بہت تاریکیاں
مہتاب اُس بستی کی گلیوں سے گزارا جائے گا

چڑھتے ہوئے سُورج کے دامن کی طرف بڑھتے ہیں ہاتھ
گرتی ہوئی دیوار کو کیسے سہارا جائے گا

○

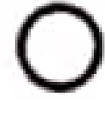
خاک لے جائیں یہاں سے کہ ہوا لے جائیں
کیا ترے شہر میں ہم چھوڑ دیں، کیا لے جائیں

بحرِ غم ہم سے بھی پیراک نہ دیکھے ہوں گے
ڈوبتے جائیں مگر خود کو سنبھالے جائیں

خشک پتوں پہ نہ تحریرِ محبت لکھو
کل کہیں اِن کو ہوائیں نہ اُڑا لے جائیں

جان مانگے ہے بہت اُن سے تعلق رکھنا
جو بچھڑنے کے لیے راہ نکالے جائیں

ہارنے والوں نے اس رُخ سے بھی سوچا ہو گا
سر کٹانا ہے تو ہتھیار نہ ڈالے جائیں



ہیں جس شجر کے تلے کب اُسے خبر کی ہے
کہ ہم پہ چھاؤں کسی دوسرے شجر کی ہے

یہ لمحہ رائگاں گزرے تو ساری عمر کا روگ
نہ رائگاں ہو تو رُسوائی عمر بھر کی ہے

غبار یاد ہے جس رہ گزر کا ہے لیکن
تھکن کا علم نہیں ہے کہ کس سفر کی ہے

ہزار لَوٹنا چاہیں ہم اس کے کوچے سے
ہمیں خبر ہے جو اوقات بال و پَر کی ہے

اَب اس سے کیجئے کیا شکوہ ہائے کم نِگہی
بہت دنوں میں تو اس نے اِدھر نظر کی ہے

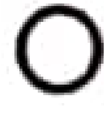
یہ لوگ بھی مرے دیوار و دَر بھی میرے ہیں
مگر فضا یہ کسی اور ہی کے گھر کی ہے

غلط لگایا تھا طاقت کا اپنی اندازہ
پھر اور اِک غلطی جنگ چھیڑ کر کی ہے

یہاں سے دُور بہت ہے جو سوچنے میں جمالؔ
زمین پاؤں کے نیچے اُسی نگر کی ہے



ناکامیوں سے عشق کی حد تک لگاؤ تھا
ہم نے ترے حصول کو مقصد بنا لیا



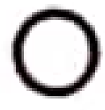
مُروتاً ہے یہ رسمِ دُعا سلام اُس سے
وگرنہ اَب ہے تعلّق برائے نام اس سے

یہ بات الگ ہے کہ رہنے کی جا نہیں دنیا
مگر جو پیدا ہوئی صورت قیام اس سے

کئی دنوں سے ہے بہت مہرباں ہے وہ مجھ پر
کئی دنوں سے پڑا ابھی نہیں ہے کام اُس سے

دل اس سے ترکِ تعلّق کو مانتا ہی نہیں
ابھی ہُوا نہیں آزاد یہ غلام اُس سے

کچھ اور پُرکشش و دل نشیں وہ لگتا ہے
جمال مِل کے تو دیکھو قریبِ شام اُس سے



کب تک کوئی آوازِ صداقت نہیں اُٹھتی
جب تک نہیں اُٹھتی ہے قیامت نہیں اُٹھتی

اُٹھتے ہیں بہت لوگ مری خاکِ وطن سے
کیا بات ہے خوشبوئے محبت نہیں اُٹھتی

ہر ایک رہِ عشق میں جاں دے نہیں سکتا
ہر ایک سے دستارِ فضیلت نہیں اُٹھتی

ڈھونڈے ہے رہِ گمشدگی اپنے مسافر
پر خوابِ مسلسل سے یہ خلقت نہیں اُٹھتی

پلکوں سے جمالؔ اپنی اُٹھا خاکِ مدینہ
ہاتھوں سے مِری جان یہ دولت نہیں اُٹھتی

○

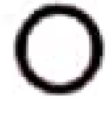
یہ بساط ہستی ہے مُہرے آزما کے چل
ایک گھر گنوا کے جا ایک گھر بچا کے چل

زیرِ دام آنے میں ہم ذرا نہ چُوکیں گے
بات تو بنا کے کر چال تو چُھپا کے چل

کم نہیں ہے منزل سے راستے کی سنگت بھی
ساتھ کچھ شجر کا دے ساتھ کچھ ہوا کے چل

ربط بھی نہ ٹُوٹے گا ساتھ بھی نہ چُھوٹے گا
اپنی گُمرہی کو اب ہمسفر بنا کے چل

ذات بھی صداقت ہے کائنات بھی سچ ہے
اِک قدم الگ سب سے اِک قدم ملا کے چل



روزِ اَزل سے بارِ نفس ڈھو رہا ہوں مَیں
مانند قرضِ عمر ادا ہو رہا ہوں میں

سب کو حقیقتیں ہیں مجھے خواب ہیں عزیز
جاگے ہوؤں کے بیچ سو رہا ہوں مَیں

مطلوب ہے اِک اور اسیری کی پیشکش
زندانِ آب و گِل سے رِہا ہو رہا ہوں مَیں

حاصل نہیں کسی بھی اِکائی کا دہر میں
جو کچھ بھی پا رہا ہوں، یہاں کھو رہا ہوں مَیں

خوش ہے بہت وہ اپنے نئے ہم سفر کے ساتھ
اتنی ذرا سی بات پہ کیوں رو رہا ہوں مَیں

○

بسر یوں شبِ عمر کر جاؤں گا
کوئی خواب دیکھوں گا ڈر جاؤں گا

یہی سوچتا گھر سے دُور آ گیا
کوئی روک لے گا، ٹھہر جاؤں گا

اگر بن نہ پائے گی کوئی جگہ
تو خالی جگہ کوئی بھر جاؤں گا

وہ جب چاہے نظریں بدل سکتا ہے
مَیں جب چاہوں اس سے مُکر جاؤں گا

مَیں پھر اُس سے وعدہ خلافی کے بعد
نیا کوئی پیمان کر جاؤں گا

کسی اور دل میں بنا لُوں گا گھر
جب اس کی نظر سے اُتر جاؤں گا

بھنک تک پڑے گی نہ اُس کو ذرا
دبے پاؤں یاں سے گزر جاؤں گا

رہے ضد پہ قائم اگر اُس کے اشک
یہی ہوگا' اک دن سنور جاؤں گا

کہ ہو راستہ واپسی کے لئے
مَیں دانستہ کچھ بھول کر جاؤں گا

یونہی مرنے والوں کو روتے ہوئے
جمال ایک دن میں بھی مَر جاؤں گا



رات کے جاگے ہوئے



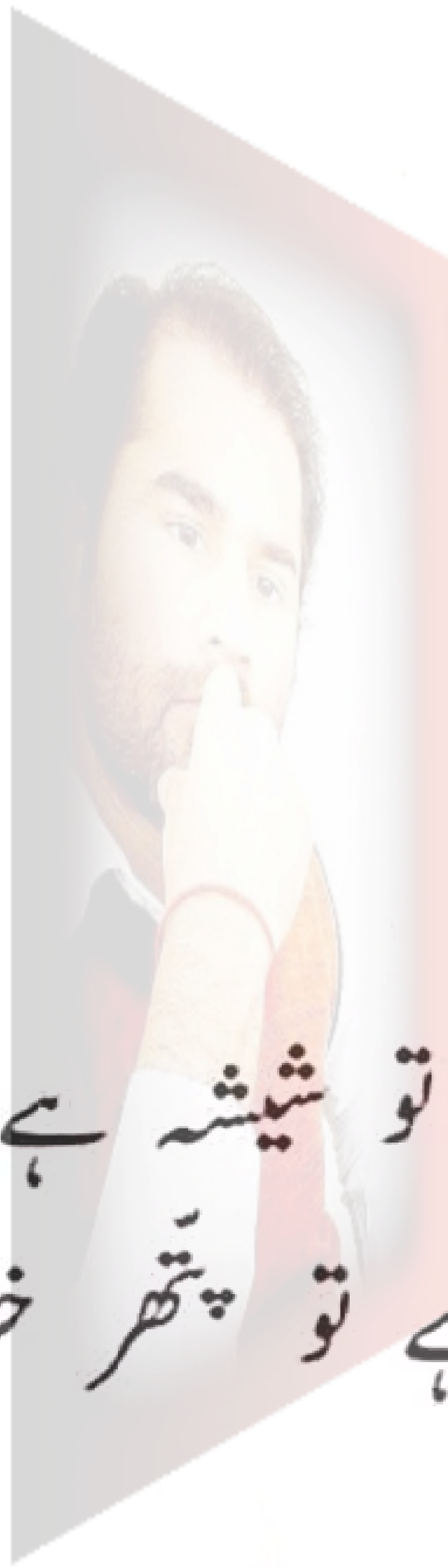
منہ اندھیرے نظر آتے ہیں جو کُچھ لوگ یہاں
یہ سحر خیز ہیں یا رات کے جاگے ہوئے ہیں

ہلال اور مُصطفیٰ

تُم دونوں کے لئے



سید حسین احسن



نازک اگر نہیں ہے تو شیشہ ہے بے جواز
بھاری اگر نہیں ہے تو پتّھر خراب ہے

اِشارے






الحمد لائبریری
فیس بک
گروپ۔
کتابیں
پڑھیے
سید حسین احسن
Imagitor

جمالؔ احسانی اور اُن کے ہم عصر

میں نے لندن کے ایک نسبتاً گم نام شاعر مستر بخش لائلپوری کے بے حد اصرار پر (فون، خط وغیرہ) ان کا فلیپ لکھ دیا۔ وہ بھی اس لیے کہ میں نے اس قدر انکار کیا تھا کہ انکار سے بھی شرمندگی ہونے لگی تھی۔ اس عزیز نے کمال حوصلہ مندی سے اپنی کتاب میں میری تحریر شامل کردی۔ اس کے بعد نہ وہ گم نام رہے نہ میں۔ اس عبارت کے ایک دو فقرے چشم گزار ہیں۔ ''۱۹۳۶ء والوں نے اپنے اردگرد بکھرے ہوئے مسائل کے اظہار کے لیے جو عوامی پیرایہ اختیار کیا تھا اس کی یکسانیت اور بے تہی مجھے سخت ناپسند ہے، مگر میری پسند ناپسند سے ساحر لدھیانوی اور کیفی اعظمی کی پاپولیریٹی پر کوئی اثر نہیں پڑا بلکہ انھی لوگوں کا لہجہ اور الفاظ مستعار لے کر ۳۵ سال (بلکہ ۴۰ سال) بعد بھی حبیب جالب اور احمد فراز جیسے لوگ اپنی ایک پرت کی شاعری کے بل بوتے پر مشاعرے لوٹتے نظر آتے ہیں۔ آپ سے اتنی درخواست ہے کہ اگر آپ مندرجہ بالا شاعروں کی شاعری سے شغف رکھتے ہیں تو پھر مستر بخش لائلپوری کا کلام بھی پڑھیے۔'' بظاہر یہ فقرہ بے ضرر تھا، میں نے دانستہ اسے ضرر رساں کر دیا تھا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ دونوں جہاں دیدہ عندلیب (جن پر ساٹھواں برس یا تو لگ چکا ہے یا لگ رہا ہے) سرمہ اور خضاب لگا کر آہ و زاریاں کرتے ہوئے پکڑے گئے۔ تیس تیس، چالیس چالیس سال تک جہالت کے زور پر شعر لکھنے کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ آدمی کو ''مہرباں چھوڑ آئے، داستاں چھوڑ آئے'' یا ''شرابیں شرابوں میں ملیں، پھول کتابوں میں ملیں'' جیسے فرسودہ رومانی جذبات پر قناعت کرنی پڑتی ہے۔ دوسرا یہ کہ ٹنڈو آدم اور چک لالہ کے غریب پرور اور سادہ لوح عوام کو ایذا دینے کے لیے انہیں گلقندی سیاست اور سیاسی گلقند چٹاتے رہتے ہیں۔

۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۷ء تک نیاز حیدر، وامق جونپوری جیسے لوگ اس قسم کی شاعری کر کے ادبی نسیان کا حصہ ہو گئے۔ ان کی ناکامی کا سبب یہ نہیں تھا کہ خدانخواستہ ان کی نیت خراب تھی یا عوام کے لیے خیر کے جذبات بری چیز ہیں، بلکہ یہ کہ شعری جمالیات اور شعری لسانیات کے ساتھ وہ اپنے ابھرے جذبات کی

آبیاری نہ کر سکے۔ ان لوگوں کو تو معاف کرنا پھر بھی آسان ہے کہ اردو ادب میں پہلی بار اس قسم کی زبان استعمال ہوئی تھی اور ان بیچاروں کو اپنے Pitfalls کی خبر نہ تھی، مگر چالیس سال بعد بھی اسی زبان میں اسی قسم کی جگالی کرنے والوں کی طرف عبرت اور حقارت سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔

دوسری طرف اسلامی ادب کے نعرہ بازوں نے ہماری پیاری زبان کی مقدس فضاؤں میں اپنے شکرے چھوڑ رکھے ہیں کہ وہ تازہ خیالی اور دور بینی کا شکار کر سکیں اور مولوی نعیم صدیقی جیسے جغادری جنات روحِ شعر کے سر پر سوار ہو کر ''عجیب سی ان کی گنگناہٹ، لطیف سی ان کی بھنبھناہٹ'' لکھ لکھ کر ہمارے صبر اور غصے کو چیلنج کریں۔

تیسری طرف جدیدیت کے نام پر اظہار اور ترسیل کا المیہ ہے اور ہر چند کہ افتخار جالب اور انیس ناگی جیسے لوگ ناکام ہوئے، مگر ان کی عزت میرے دل میں ہے کہ انہوں نے تجربے سے چشم پوشی نہیں کی اور اپنے قد سے بڑھ کر دراز دستی کی کوشش کی۔ میں ان کا نوحہ بھی پڑھوں گا اور انہیں سلام بھی کروں گا کہ شاعری کی نجات نہ کلاسیکی سمندر میں ڈبکیاں لگانے میں ہے نہ انیس اور دبیر کی جھیلوں میں ڈھیلا پھینکنے میں، بلکہ زبان و بیان کے نت نئے تجربات میں ہے۔ اس میں ناکامی بھی ہو گی اور کامیابی بھی، مگر شاعری شرمندہ نہیں ہو گی۔

میں نہ سیاست کے خلاف ہوں نہ مذہب کے اور ہر چند کہ مذہبی آدمی نہیں ہوں، مگر ایک کمیٹڈ سوشلسٹ ہوں اور اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ دونوں طرح کے لوگوں کے یہاں اچھی اور بڑی شاعری کے جراثیم موجود ہوتے ہیں اور خود ہمارے یہاں بھی اقبال اور فیض نے دونوں طرح کے امکانات پورے کر کے دکھا دیئے ہیں۔ مگر ''مسجد قرطبہ'' ہو کہ ''شب گزیدہ سحر'' شعری جمالیات اور شعری لسانیات دونوں روح کے تاروں کو چھوتے ہیں۔ کھلا کہ شاعر کا مسلک چاہے کچھ ہو وہ اپنے شعر کے آہنگ، لفظوں کی نشست، بیان کی تازگی، زبان کے سفر کے علم اور اپنی ذات اور عہد کے شعور کے بغیر نہ آگے جا سکتا ہے نہ پہچانا جا سکتا ہے۔

میں نے تمہید اتنی لمبی اس لیے کر دی ہے کہ آپ یہ سمجھ سکیں کہ کلیشے، پی آر، مشاعرہ بازی، ریڈیو، ٹی وی اور اخباری شہرت بازی سے پاکستان اور ہندوستان کے نئے، تازہ کار، مخلص اور خوش الحان شاعروں کو

بدل ہونے کی ضرورت نہیں اور انہیں اظہار اور بیان کے نت نئے تجربوں کے ساتھ احساس و خیال کے ہفت رنگ آسمانوں اور زمینوں کا سفر جاری رکھنا چاہیے اور صبر سے کام لینا چاہیے کہ دس پندرہ سال شعر کہنے کے بعد نہ کوئی عظیم بن سکتا ہے نہ منفرد لہجے کا مالک ہو سکتا ہے۔ ہاں اگر اس میں جان ہوتی ہے تو وہ اپنی انفرادیت کے امکانات کی طرف اپنے عہد کے بالغ اور صاحب نظر لوگوں کی توجہ منعطف کرانے میں ضرور کامیاب ہوتا ہے۔ ادب میں تسلیم اور شناخت کا عمل سست رو ہوتا ہے (اور اس بات پر خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے)۔ میں اپنے پیارے دوست گوپی چند نارنگ کی طرح جلد بازی سے کام لے کر صلاح الدین پرویز اور عزیزی افتخار عارف کی طرح جمال احسانی کو شرمندہ نہیں کروں گا کہ نارنگ کی طرح جھینپنے کا یارا ابھی مجھ میں نہیں (بعض تحریریں عجیب ہوتی ہیں کہ شاعر اور نقاد دونوں کی شرمندگی کا باعث بنتی ہیں) تو جمال احسانی میں کیا ہے کہ میں نے مروجہ شعری منظر نامے کا اتنی تفصیل سے جائزہ لیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ۲۵ اور ۴۰ سال کے درمیان (یہ عمر کا بیان ہے سنہ کا نہیں) کے لکھنے والوں نے کراچی، لاہور، سرگودھا، دلی، بمبئی اور احمد آباد کی ادبی فضاؤں میں جو تازگی اور پرکاری کی رنگا رنگ دھنک تانی ہے جمال احسانی کی شاعری اسی دھنک کا ایک رنگ ہے۔ دس سال پہلے میں ان کا ایک مصرع شہروں شہروں لیے پھرا تھا ''ایک جگہ تو گھوم کے رہ گئی ایڑی سیدھے پاؤں کی'' یہ کوئی عظیم مصرع نہیں تھا، مگر انوکھا اور اچھوتا ہے۔ اس میں عصر بھی ہے اور عصر سے آگے جانے کا امکان بھی۔ اس میں زبان کے سفر کی کہانی بھی ہے، یعنی یہ کہ اس قسم کا مصرع دیا شنکر نسیم اور قائم چاند پوری نہیں لکھ سکتے تھے۔ تب سے اب تک جمال احسانی نے عظیم شاعری تو پیدا نہیں کی، مگر تازگی احساس اور ندرت زبان کا سفر جاری رکھا ہے اور مجھ جیسے لوگوں کو مایوس نہیں کیا ہے۔ ''ستارہ سفر'' کے ایسے شعروں کے بعد

تجھ سے اکتا جانے کی اک ساعت بھی
تیرے عشق ہی کے دوران میں گزری ہے

خموش ہوں تو مجھے اتنا کم جواز نہ جان
مرے بیان سے باہر بھی ہیں سبب میرے

وہ جس منڈیر پہ چھوڑ آیا اپنی آنکھیں میں
چراغ ہوتا تو لو بھول کر چلا جاتا

دو اجالوں کو ملاتی ہوئی اک راہگزر
بے چراغی کے بڑے رنج سہا کرتی ہے

ہے واقعہ ہدف سیل آب تھا کوئی اور
مرا مکان تو بس راستے میں آیا ہے

بچھڑا تو اک جہان تعلق اجڑ گیا
جس جس سے رابطے تھے اسی کے سبب سے تھے

(اور اس طرح کے بے شمار مصرعے اور اشعار جو "ستارہ سفر" کی روشنی ہیں) اس مجموعے کی غزلوں کے یہ اشعار بھی دیکھتے چلیے جنھیں پڑھ کر میں نے اپنی روح میں ایک نشاط انگیزی کی کیفیت محسوس کی

ہونے کی گواہی کے لیے خاک بہت ہے
یا کچھ بھی نہیں ہونے کا ادراک بہت ہے

مقصود صرف ڈھونڈنا کب تھا تجھے، سو میں
جس سمت تو نہیں تھا ادھر بھی نکل گیا

بہکا رہا ہے کون مجھے یوں ترے خلاف
اک مرتبہ خود اپنی طرف دھیان بھی گیا

مدتوں بعد شب ماہ اسے دیکھا تھا
پر کسی اور کے ہمراہ اسے دیکھا تھا

جو دل کے طاق میں تو نے چراغ رکھا تھا
نہ پوچھ میں نے اسے کس طرح ستارہ کیا

وہ جس نے دیکھا لیا ہے اسے نظر بھر کے
پس غبار و تبہ آب دیکھ سکتا ہے

(اور اس طرح کے بہت سے اشعار اور مصرعے جو اس کتاب کی زینت ہیں)

یہ نہ سمجھو لیجے کہ بہت سے خراب اشعار "ستارہ سفر" میں بھی تھے اور "رات کے جاگے ہوئے" میں بھی ہیں اور کیوں نہ ہوں کہ شاعر ابھی تجرباتی دور سے گزر رہا ہے' مگر بنیادی طور سے تازہ بیانی اور تازہ کاری سے ہم کلام ہے۔ میں کھلے دل سے اس مجموعے کا خیر مقدم کرتا ہوں۔ شاید یہ میری خوش گمانی ہو' مگر مجھے اندیشہ ہے کہ یہ آواز نئی تہہ داریوں سے آشنا ہو کر اور نئے نغمے جنم دے گی۔



ساقی فاروقی

۱۸ نومبر ۱۹۸۵ء

جمال احسانی

تلاش اور حیرت کے سائبان تلے

تخلیق کی بھول بھلیوں میں سوچے سمجھے منصوبے کے تحت پس غبار و تہہ آب دیکھنے کی حکمت عملی باشعور ہونے کی شہادت ہے' اور یہی شہادت احساس کے اندرونی تناؤ کے فطری نتیجے میں منظر بہ منظر اور سینہ بہ سینہ پھیلتی چلی جاتی ہے۔

صبح دم دیکھا تو خشکی پر تڑپتا تھا بہت
ایک منظر دیدہ نمناک سے بچھڑا ہوا

دیدہ نمناک سے بچھڑا ہوا یہی اندوہ ناک منظر تخلیق کی جدیدیت سے گزرتا ہوا ایک ایسا آئینہ بن جاتا ہے جس میں حیات کے سبھی مناظر زنجیر ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ آئینہ آدم کے باطن کا سراپا بھی ہے اور کائنات کا مرقع بھی، صبح ازل اور شام ابد کے مابین خارجی تغیرات اور اندرونی حیرت و انکشاف کا عکس بھی ہے اور کمیت و کیفیت کا رقص بھی' ابن آدم کی مدھم روشنی بھی اور ارتقا پذیر انسان کی باطنی سیاہی کی چکاچوند بھی۔

پیالہ کون و مکاں کے ساتھ گردش کرنے والے جمال احسانی کی شاعری تلاش آمیز حیرت کا دوسرا نام ہے۔ یہ رات کے جاگے ہوئے نشاطیہ کرب کی وہ نیند ہے جو پہلی ہی کروٹ میں حرام ہو جاتی ہے۔ یہ وہ کہانی ہے جو اپنے خمیر میں روایتی ہونے کے باوجود روایت گزیدہ نہیں۔ یہ کہانی گاؤں کی پگڈنڈی کو شہر کی سڑک سے جوڑ کر صنعتی عہد کی پیچیدگیوں میں گم ہو جاتی ہے۔ اس کہانی کا مرکزی خیال خود آگاہی ہے۔

ذرا اس کرب کا اندازہ کیجئے
میں اپنے آپ کو پہچانتا ہوں

(ستارہ سفر)

ستارہ و جبرئیل سے سرسری گزر کے
رکی بالآخر نگاہ آئینہ دار مجھ پر!

یہ خود آگہی انسانی کلیت کا ادراک تو ہے، لیکن نگاہ آئینہ دار کی تفہیم کا علم نہیں

کیا ہے یہ مجھ کو علم نہیں ہو سکا ابھی
کچھ ہے کہ جو بساط سے باہر ضرور ہے

یہی وہ تجسس آمیز بے خبری ہے جو تخلیق کا سنگ بنیاد رکھتی ہے..... تلاش اور جستجو کا چشمہ اگر ضمیر کے باطن سے پھوٹ بہے تو انسان آتش نمرود میں بے خطر کود پڑتا ہے، اور اگر یہی دھارا ضمیر کے خارجی مضمرات سے خرام کرے تو شاعری جنم لیتی ہے۔ ایک ایسی شاعری جو ضمیر کے باطن میں پیوست ہونا چاہتی ہے۔ جمال احسانی کی شاعری بھی اسی پس منظر کا ایک منظر ہے۔ یہ شاعری کائنات خواہش و امکاں کا ایک ایسا منظر نامہ ہے جس میں بدن روح کی پوشاک سے بچھڑ جاتا ہے اور مادی سیمابیت کی روح اپنے بنائے ہوئے دائرے توڑنے لگتی ہے۔

''ستارہ سفر'' سے لے کر ''رات کے جاگے ہوئے'' تک کا سفر دراصل بتدریج تغیر کی شہادت نہیں بلکہ اچانک رونما ہونے والی فکری تبدیلی کا اظہار ہے۔ ''ستارہ سفر'' میں جمال احسانی بوندا باندی کے درمیان اپنے گھر کی چھت پر کسی چراغ کے ہمراہ بھیگتا نظر آتا ہے۔ اور ''رات کے جاگے ہوئے'' میں تلاش اور حیرت کے سائبان تلے کسی گمشدہ کل کی کھوج میں سرگرداں بھٹکتا دکھائی دیتا ہے۔

میں کاروان لمحہ آئندہ میں شریک
رہتا ہوں ایک گمشدہ کل کی تلاش میں

جمال احسانی اپنے تجربات و مشاہدات کے اظہار کے لیے کلاسیکی روایت سے انحراف کرتا ہوا ذرا

کم ہی نظر آتا ہے۔ اس کے ہاں عصری پس منظر میں زبان کی تراش خراش' الفاظ کے حسن' موزونیت و مناسبت' بندش کی چستی' تراکیب کی دل آویزی اور محاورات کی برجستگی کا جداگانہ استعمال نظر آتا ہے' مثلاً

رونق شہر بھی صحرا کی فضا لگتی ہے
دل تو وہ بات کہے گا جو خدا لگتی ہے
(ستارہ سفر)

روز ازل سے خوگر سیلاب گریہ ہے
شہر شکستہ دل کہ لب آب گریہ ہے

یوں نہ ہو بول پڑوں میں تری خاموشی پر
اور تجھے بزم سے مہمان اٹھانا پڑ جائے

کیا ہوتا اگر میں نظر انداز نہ کرتا
جو دوسرا مطلب تری تحریر سے نکلا

بیکار سمجھ کر میں جلا بیٹھا جب اس کو
اک کام اچانک تری تصویر سے نکلا

چراغ بجھتے چلے جا رہے ہیں سلسلہ وار
میں خود کو دیکھ رہا ہوں فسانہ ہوتے ہوئے

یہ سیل اشک بھی اپنا ہے آنکھ بھی اپنی
کھڑے رہو کہ یہ دریا یہیں پہ اترے گا

چلے تو ہو سفرِ عشق پر خیال رہے
کہیں چڑھے گا یہ دریا کہیں پہ اترے گا

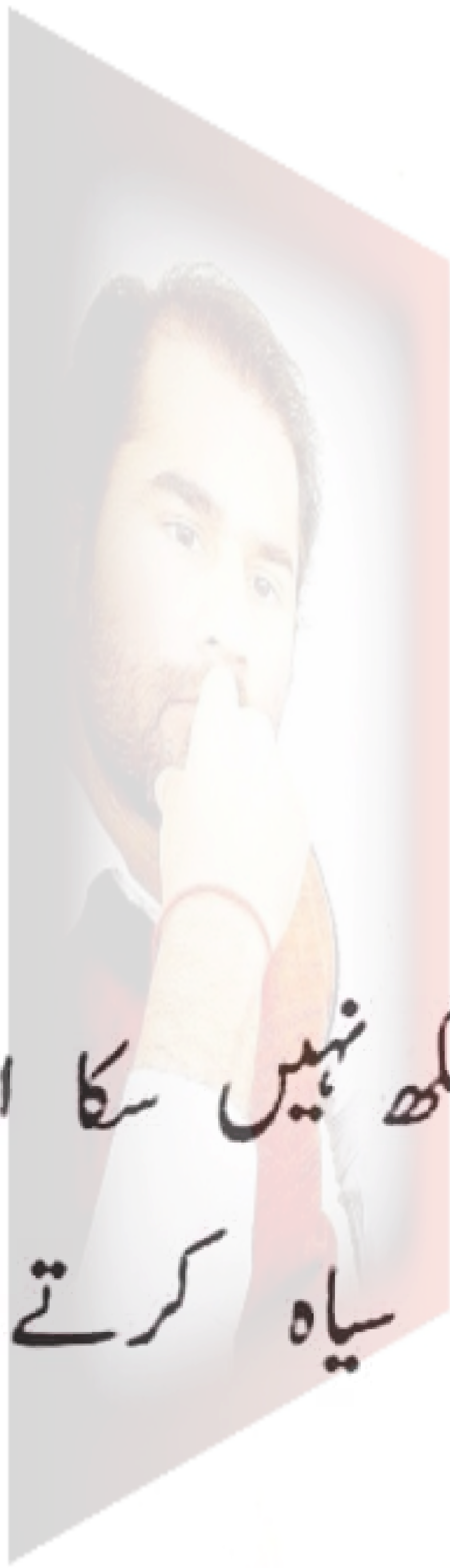
یا

نہ کوئی فال نکالی نہ استخارہ کیا
بس ایک صبح یونہی خلق سے کنارہ کیا

محاورات کی برجستگی اور بندش کی دل آویزی کی اہمیت سے قطع نظر تخلیقی جمالیات کی اپنی زبان ہوتی ہے جو نامانوس ہوتے ہوئے بھی اجنبی معلوم نہیں ہوتی۔ جمال احسانی کا یہ گوشہ بیشتر دوسرے شعراء کی طرح نسبتاً کم نمو پذیر ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ جمال احسانی اس انکشاف سے باخبر ہے اور ہمیشہ اسی تگ و دو میں لگا رہتا ہے کہ جو یہاں ظاہر نہیں ہے وہ کہاں پوشیدہ ہے۔ مجھے جمال احسانی کی یہی ادا اچھی لگتی ہے اور خود بقول جمال احسانی

نازک اگر نہیں ہے تو شیشہ ہے بے جواز
بھاری اگر نہیں ہے تو پتھر خراب ہے

جاوید صبا
۱۴ اکتوبر ۱۹۸۶ء



جو حرف چاہتا ہوں لکھ نہیں سکا اب تک
زمانہ ہو گیا کاغذ سیاہ کرتے ہوئے

O

شام ابد نہ صبح ازل کی تلاش میں
صدیوں سے ہوں یہاں کسی پل کی تلاش میں

میں کاروان لمحہ آئندہ میں شریک
رہتا ہوں ایک گمشدہ کل کی تلاش میں

گردش میں ہوں پیالہ کون و مکاں کے ساتھ
شاید کسی کمی و خلل کی تلاش میں

میں نے تو اپنے عکس کو محفوظ کر لیا
اب آئنہ ہے ردعمل کی تلاش میں

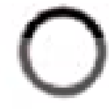
یک رنگی جہاں میں بصد عجز و انکسار
میں ہر گھڑی ہوں اپنے بدل کی تلاش میں

اک میں ہی بے یقیں نہیں اس دہر کا مکیں
ہر چیز ہے جواز و علل کی تلاش میں

افسوس بے ارادہ و نیت سرِ جہاں
رہتے ہیں لوگ حسنِ عمل کی تلاش میں

کیسے یہاں دعائے بزرگاں میں ہو اثر!
سارے درخت رہتے ہیں پھل کی تلاش میں

دنیا جمال کچھ بھی کہے جانتا ہوں میں
سارا سفر ہے میرا غزل کی تلاش میں



کوزہ دنیا ہے اپنے چاک سے بچھڑا ہوا
اور اس کے بیچ میں افلاک سے بچھڑا ہوا

اس جگہ میں بھی بھٹکتا پھر رہا ہوں آج تک
جس جگہ تھا راستہ پیچاک سے بچھڑا ہوا

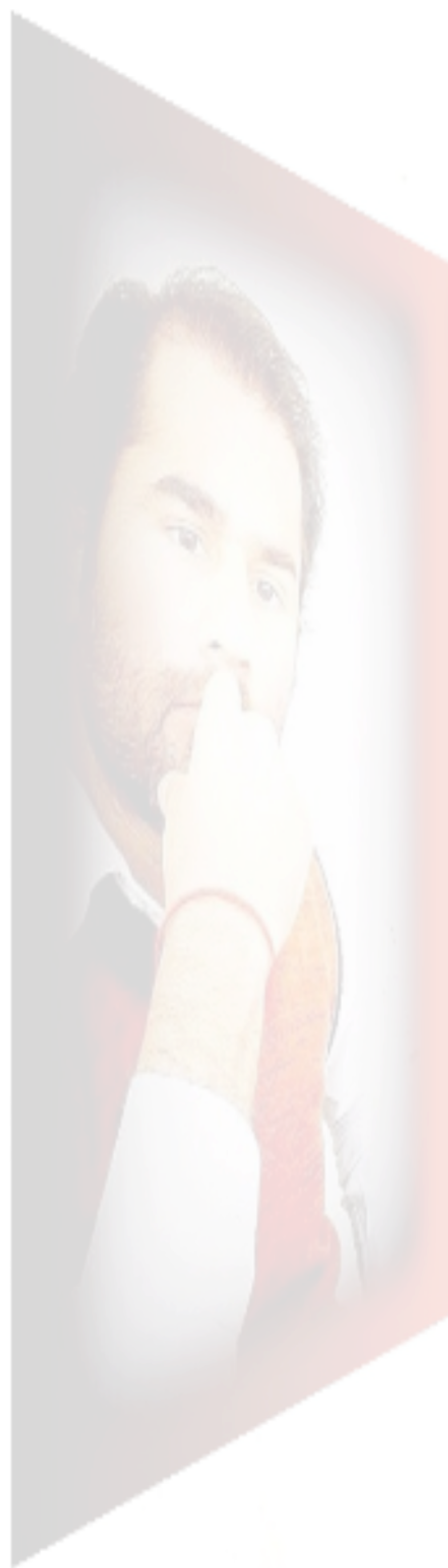
دن گزرتے جا رہے ہیں اور ہجوم خوش گماں
منتظر بیٹھا ہے آب و خاک سے بچھڑا ہوا

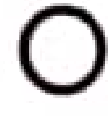
صبح دم دیکھا تو خشکی پر تڑپتا تھا بہت
ایک منظر دیدہ نمناک سے بچھڑا ہوا

اس جہان خستہ سے کوئی توقع ہے عبث
یہ بدن ہے روح کی پوشاک سے بچھڑا ہوا

جب بھی تولا بے نیازی کی ترازو میں اسے
وہ بھی نکلا ضبط کے ادراک سے بچھڑا ہوا

اِک ستارہ مجھ سے مل کر رو پڑا تھا کل جمالؔ
وہ فلک سے اور میں تھا خاک سے بچھڑا ہوا





دھرتی بھی آسماں کے برابر خراب ہے
چادر ہے جیسی ویسا ہی بستر خراب ہے

اس کائنات خواہش و امکاں سے اس طرف
منظر ہے ایک اور وہ منظر خراب ہے

آگاہ میں چراغ جلاتے ہی ہو گیا
دنیا مرے حساب سے بڑھ کر خراب ہے

بیدار بھی ہو نیند سے چارہ گر جہاں
حالت ترے مریض کی یکسر خراب ہے

ایسی جگہ اسیر نفس کو رکھا گیا
دیوار سے زیادہ جہاں در خراب ہے

اس کے لیے ہی آئے گی آئی اگر بہار
وہ پھول جو کہ باغ سے باہر خراب ہے

نازک اگر نہیں ہے تو شیشہ ہے بے جواز
بھاری اگر نہیں ہے تو پتھر خراب ہے

دنیائے پر کشش بھی ہے، ہر سو کھڑی ہوئی
نیت بھی آدمی کی سراسر خراب ہے

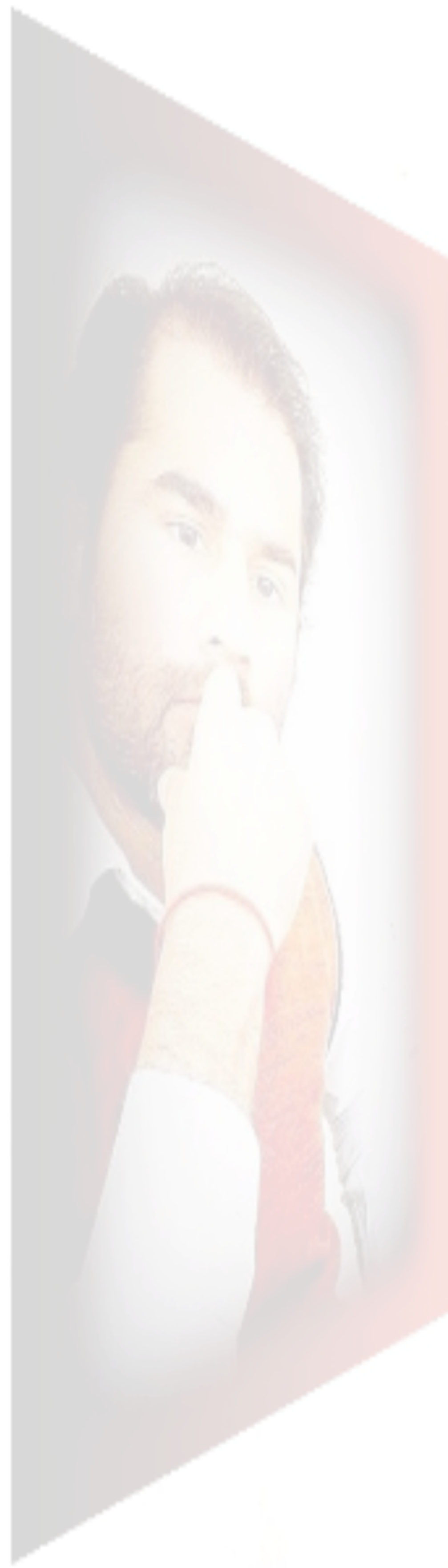
آنکھوں سے اب وہ خواب کو نسبت نہیں رہی
اک عمر ہو گئی یہ سمندر خراب ہے

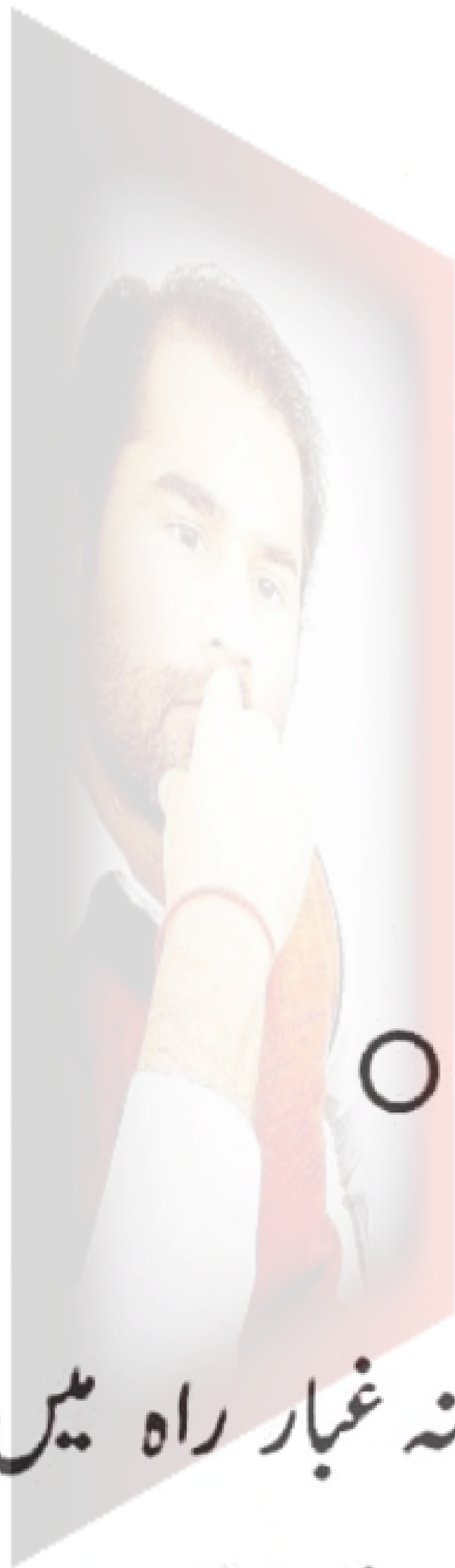
تاریخ سے محال ہے لانا مثال کا
یہ عہد اپنی روح کے اندر خراب ہے

یہ بات بھی چھپی نہ رہے گی بہت کہ میں
اتنا نہیں ہوں جتنا مقدر خراب ہے

کچھ ہاتھ خواب میں تھے گریبان پر مرے
اک شب خیال آیا تھا یہ گھر خراب ہے

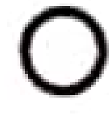
بسنے نہیں تو سیر کی خاطر چلو جمالؔ
ایک اور شہر چند قدم پر خراب ہے





کبھی دشت میں نہ غبار راہ میں دیکھتے
مجھے دن ڈھلے کسی خیمہ گاہ میں دیکھتے

ذرا دیر کر دی جمالؔ ورنہ اسے تو ہم
کبھی بزم میں کبھی رزم گاہ میں دیکھتے



پانی کو پہلے اس نے ملایا ہے خاک سے
پھر اس کے بعد مجھ کو بنایا ہے خاک سے

اس نے بھی خاک ہی سے بڑھائی ہے تیرگی
میں نے بھی ہر چراغ جلایا ہے خاک سے

زنجیر کر رہے ہیں مناظر حیات کے
آئینہ اس نے خوب سجایا ہے خاک سے

ہمراز کر کے آتش خواب و خیال کو
آب رواں پہ نقش بنایا ہے خاک سے

موجود ہے اس آنکھ کے نزدیک ہی کہیں
اک شہر آرزو کہ بسایا ہے خاک سے

آرام کر کہ پھر کبھی موقع نہ آئے گا
دو چار روز اور یہ سایہ ہے خاک سے

اس نے بھی مجھ پہ تیغ ستم کھینچ لی جمالؔ
میں نے بھی ایک پھول اٹھایا ہے خاک سے



○

رہنا نہیں اگرچہ گوارا زمین پر
لیکن اک آدمی ہے ہمارا زمین پر

طرفہ کہ رسمِ گریہ و زاری بھی اٹھ گئی
مشکل تو پہلے ہی تھا گزارہ زمین پر

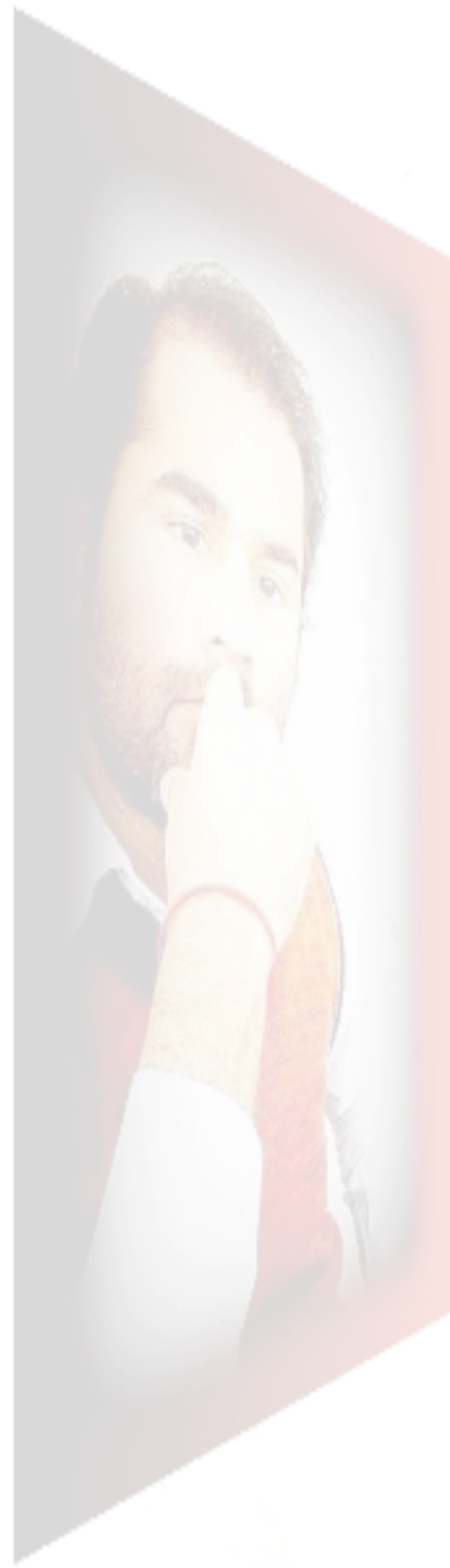
پہلے تو دی مجھے بینائی اور پھر
منظر عجیب اس نے اتارا زمین پر

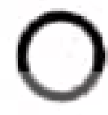
بھٹکے ہوؤں کو راہ دکھانے کو کم نہیں
ٹوٹے ہوئے دیے کا کنارا زمین پر

اس کی نظر بدلنے سے پہلے کی بات ہے
میں آسمان پر تھا ستارہ زمین پر

باقی تو جو بھی کچھ ہے اضافی ہے سب یہاں
اک آنکھ ہے اور ایک نظارہ زمین پر

دیکھا نگاہ بھر کے مجھے اس نے پھر جمالؔ
روشن کیا چراغ دوبارہ زمین پر





عقدہ کشائی وجود، یوں ہے محال بھی مجھے
رکھنا ہے راز آتش و آب و سفال بھی مجھے

رد گماں کے واسطے اپنا کوئی ثبوت دے
اور مدار جسم سے آ کے نکال بھی مجھے

ہوتے رہے ہیں عمر بھر کام دعاؤں سے مگر
کرتا رہا بہت خراب ایک سوال بھی مجھے

ٹوٹ گئے سبھی بھرم، کیسا وجود کیا عدم
اب نہ سنبھال پائے گا تیرا خیال بھی مجھے

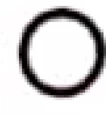
عرصہ کارزار میں آج کسی کے وار سے
جان بچانے کا ہوا کتنا ملال بھی مجھے

اے نگہِ ستارہ جو، دیکھ کے ملتفت تجھے
آج بہت نڈھال ہوں آج سنبھال بھی مجھے

میں کسی اور رنگ میں، تو کسی اور امنگ میں
گزرا ہے کس قدر گراں تیرا وصال بھی مجھے

ایسا بچھڑ گیا تھا میں خود سے کہ پھر کبھی جمالؔ
مجھ سے نہیں ملا سکی میری مثال بھی مجھے





دونوں میں اک مشترک قدر زیاں پوشیدہ ہے
ناگہاں ظاہر ہوں میں وہ ناگہاں پوشیدہ ہے

ہر نفس میں اس تگ و دو میں بسر کرتا رہا
جو عیاں ہوتا نہیں ہے وہ کہاں پوشیدہ ہے

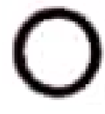
اب کسی منظر میں آنا ہے سراسر رائگاں
وہ وہیں اچھا رہے گا جو جہاں پوشیدہ ہے

جل گیا تو باغ ہو جائے گا سارا ریگ زار
ایک نقش پا کہ جس میں کارواں پوشیدہ ہے

ایک ذرے میں نہاں ہے راز دھرتی کا جمال
اک ستارہ ہے کہ جس میں آسماں پوشیدہ ہے

OOO

کتنی گنجائشیں اس آنکھ نے رکھی ہیں جمالؔ
ہجر کی آس میں بھی وصل کے امکان میں بھی



ہونے کی گواہی کے لیے خاک بہت ہے
یا کچھ بھی نہیں ہونے کا ادراک بہت ہے

اک بھولی ہوئی بات ہے اک ٹوٹا ہوا خواب
ہم اہل محبت کو یہ املاک بہت ہے

کچھ در بدری راس بہت آئی ہے مجھ کو
کچھ خانہ خرابوں میں مری دھاک بہت ہے

پرواز کو پر کھول نہیں پاتا ہوں اپنے
اور دیکھنے میں وسعت افلاک بہت ہے

کیا اس سے ملاقات کا امکاں بھی نہیں اب
کیوں ان دنوں میلی تری پوشاک بہت ہے

آنکھوں میں ہیں محفوظ ترے عشق کے لمحات
دریا کو خیال خس و خاشاک بہت ہے

تنہائی میں جو بات بھی کرتا نہیں پوری
تقریب میں مل جائے تو بے باک بہت ہے

نادم ہے بہت تو بھی جمالؔ اپنے کیے پر
اور دیکھ لے وہ آنکھ بھی نم ناک بہت ہے



○

تمام ارض و سما کو گواہ کرتے ہوئے
کوئی گزر گیا مجھ پر نگاہ کرتے ہوئے

جو بوجھ اپنے نہیں وہ بھی ڈھونے پڑتے ہیں
اس آب و خاک سے مجھ کو نباہ کرتے ہوئے

میں چپ کھڑا ہوں یہاں اور گزرتا جاتا ہے
کوئی سوال کوئی انتباہ کرتے ہوئے

جہان اجر و سزا میں بجز دل آزاری
میں سوچتا نہیں کوئی گناہ کرتے ہوئے

جو حرف چاہتا ہوں، لکھ نہیں سکا اب تک
زمانہ ہو گیا کاغذ سیاہ کرتے ہوئے

دماغ نے کہاں مانی کبھی فقیر کی بات
یہ دل ذرا تھا اسے بادشاہ کرتے ہوئے

اب اس پہ ترک مراسم کے وقت غور نہ کر
جو بات سوچنی تھی رسم و راہ کرتے ہوئے

جمالؔ وار بھی اوچھا نہیں کیا لیکن
ہوا تھا رنج بھی اس کو تباہ کرتے ہوئے



O

بجز چراغ کسی اور کو خبر کیا ہے
یہ شام ہونے سے پہلے ہوا کا ڈر کیا ہے

نہ میں ہی کھلتا ہوں تجھ پر نہ تو عیاں مجھ پر
ترے سوا ترے اقرار سے ادھر کیا ہے

میں اک سوال سے نکلوں تو دوسرے میں رہوں
مرے علاوہ بھی کچھ ہے یہاں مگر کیا ہے

مگر یہ بات میں ہمسایوں سے نہیں کہتا
کہ یہ اہانت دیوار و در ہے گھر کیا ہے

ہر ایک گوشہ کون و مکاں کی سیر کے بعد
جو اپنی سمت نہ لے آئے وہ سفر کیا ہے

خیال آیا مجھے گردش زمیں سے جمالؔ
کہیں پہنچنے کی کوشش ہے رہگزر کیا ہے

○

وہ اس جہان سے حیران جایا کرتے ہیں
جو اپنے آپ کو پہچان جایا کرتے ہیں

جو صرف ایک ٹھکانے سے تیرے واقف ہیں
تری گلی میں وہ نادان جایا کرتے ہیں

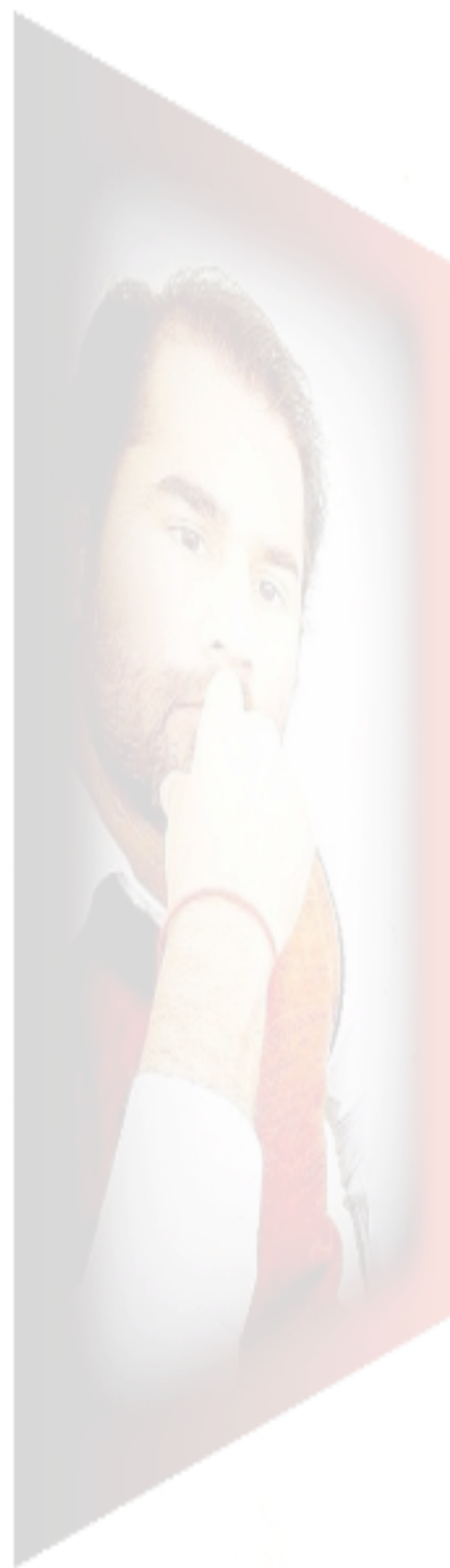
کسی کے ہونے نہ ہونے کے بارے میں اکثر
اکیلے پن میں بڑے دھیان جایا کرتے ہیں

میں اب کبھی نہ دکھوں گا کسی کے مرنے سے
کہ شب گزار کے، مہمان جایا کرتے ہیں

جو اصل بات ہے اس کو چھپانے کی خاطر
کبھی کبھی غلطی مان جایا کرتے ہیں

یہ بات آتے ہوئے سوچتا نہیں کوئی
کہ سب یہاں سے پریشان جایا کرتے ہیں

جمالؔ ہم تو تجھے یہ بھی اب نہیں کہتے
کبھی کسی کا کہا مان جایا کرتے ہیں



○

واقعی کوئی اگر موجود ہے
پھر تو یہ دکھ عمر بھر موجود ہے

بیچ کا رستہ نہیں باقی کوئی
یا خدا ہے یا بشر موجود ہے

اس کو پانے کی توقع ہے بہت
جب تلک یہ چشم تر موجود ہے

اس کے ملنے ہی سے پہلے دل میں کیوں
اس کے کھو جانے کا ڈر موجود ہے

کوئی منزل کیسے تنہا سر کریں
ہر سفر میں ہم سفر موجود ہے

عادت خانہ خرابی ہے جمالؔ
ورنہ اچھا خاصا گھر موجود ہے

○

فگار سینہ و آفت رسیدہ لوگوں سے
یہ ساری رونقیں ہیں آب دیدہ لوگوں سے

جب آنکھ کھلتی ہے تو کیا خیال آتا ہے
یہ بات کون کرے خواب دیدہ لوگوں سے

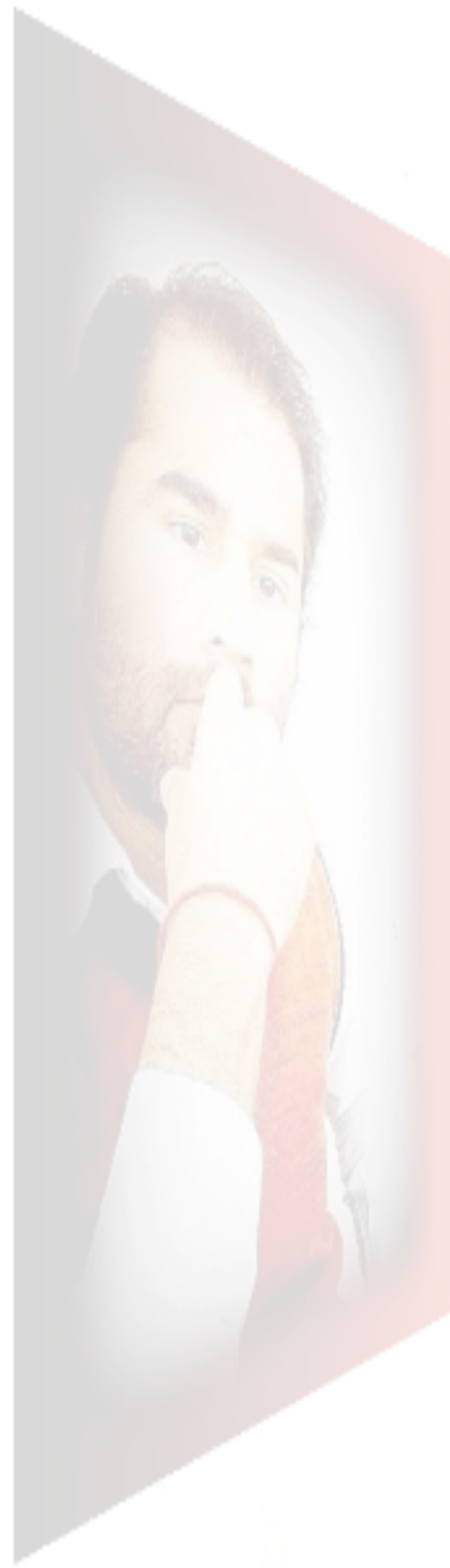
یہ پیرہن کی چمک کیوں اداس کرتی ہے
کبھی یہ پوچھ تو دامن دریدہ لوگوں سے

عقیدے کا نہیں ہونا بھی اک عقیدہ ہے
مجھے الگ ہی سمجھ باعقیدہ لوگوں سے

ہر ایک راستہ جاتا ہے موت کی جانب
نہ دل گرفتہ ہو ان سرکشیدہ لوگوں سے

نیا چراغ کبھی یوں بھی ہوتا ہے روشن
کہ اختلاف کرے برگزیدہ لوگوں سے

ہر ایک لمحہ آئندہ کا فسوں ہے نیا
مجھے یہ علم ہوا سن رسیدہ لوگوں سے



○

یہ راز ہو ہی چکا ہے اب آشکار مجھ پر
ہے اس جہاں کا تمام دارومدار مجھ پر

ستارہ و جبرئیل سے سرسری گزر کے
رکی بالآخر نگاہ آئینہ دار مجھ پر

عجیب شب ہے کہ غار اندر بھی روشنی ہے
عجب گھڑی ہے کہ فرض ہے انتظار مجھ پر

خزانہ خاک و شمع کا ورثہ دار ہوں میں
خرام ابر و ہوا کا ہے انحصار مجھ پر

بکھر گیا ہے اک آئنہ ٹوٹ کر نظر میں
ہوئی ہے یہ کائنات گرد و غبار مجھ پر

ہمیشہ رہتا ہوں حالت گریہ و دعا میں
کہ منکشف ہے ہر آنے والی بہار مجھ پر

مجھے کبھی اشتباہ سے روکتا نہیں ہے
مرے سوا بھی کسی کا ہے اختیار مجھ پر

انہی کے زخموں سے نیم جاں ہے وجود میرا
تری طرف سے ہوئے نہیں ہیں جو وار مجھ پر

بغیر سود و زیاں جو لمحہ گزر گیا ہے
اس ایک لمحے کے قرض ہیں بے شمار مجھ پر

نہ کوئی زنجیر میرے پیروں میں ڈالتا ہے
نہ بند کرتا ہے کوئی راہ فرار مجھ پر

لگام اسپ حیات میرے سپرد کر کے
جمالؔ اس نے بہت کیا اعتبار مجھ پر

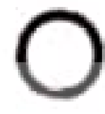
OOO

تجھی پہ ٹوٹے نہیں ہیں اذیتوں کے پہاڑ
ہمیں بھی دیکھ کہ تجھ کو بھلا دیا کیسا



کفِ شامِ ہجر میں کچھ نہ تھا سرِ شاخسار کوئی نہ تھا
وہ گھڑی بھی عشق میں آئی جب پسِ انتظار کوئی نہ تھا

یہی دیکھا کوچہ عشق میں یہی کلکِ جاں سے رقم کیا
کوئی تھا اگر تو غبار تھا وہاں شہسوار کوئی نہ تھا



اپنا جب بوجھ مری جان اٹھانا پڑ جائے
دوسروں کا نہ کچھ احسان اٹھانا پڑ جائے

اس قدر عیش محبت پہ نہ ہو خوش کہ تجھے
دوسرے عشق میں نقصان اٹھانا پڑ جائے

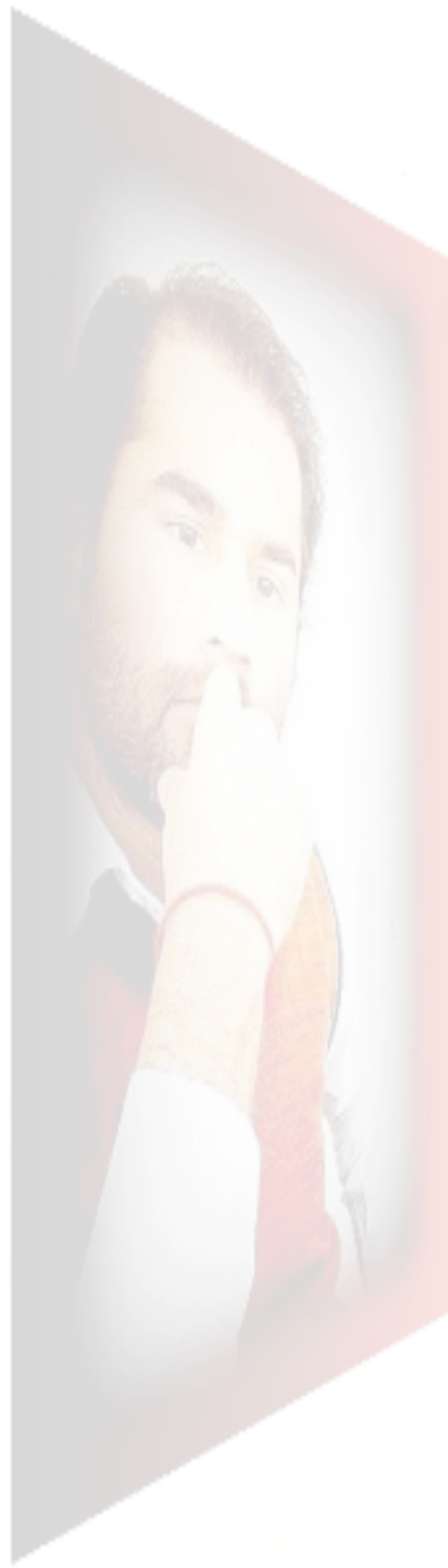
اس سرائے میں نہ پھیلائیے اجزائے حیات
جانے کس وقت یہ سامان اٹھانا پڑ جائے

یوں نہ ہو بول پڑوں میں تری خاموشی پر
اور تجھے بزم سے مہمان اٹھانا پڑ جائے

پھر بدل جائے نہ اس وعدہ امروز سے تو
اور ہمیں دوسرا طوفان اٹھانا پڑ جائے

کیا تماشا ہو سر کوچہ دلدار اگر
میرے جیسا کوئی نادان اٹھانا پڑ جائے

میں تو مر جاؤں اسی وقت اگر مجھ کو جمال
عشق سے ہاتھ کسی آن اٹھانا پڑ جائے



○

وہ یوں ہی نہیں عشق کی جاگیر سے نکلا
مجبوری نان و نمک و شیر سے نکلا

پایا ہے کسی دائرہ خاک میں خود کو
میں جب بھی کسی حلقہ زنجیر سے نکلا

یہ سامنے جو ڈھیر خزانے کا پڑا ہے
نقشے سے نہیں لغزش رہگیر سے نکلا

وہ جلوہ نما بام پہ تھا دیر سے لیکن
میں خود ہی اسے دیکھنے تاخیر سے نکلا

بے کار سمجھ کر میں جلا بیٹھا جب اس کو
اک کام اچانک تری تصویر سے نکلا

کیا ہوتا اگر میں نظر انداز نہ کرتا
جو دوسرا مطلب تری تحریر سے نکلا

دہری ہوئی جاتی تھی کمر بوجھ سے میری
جب خواب لیے کوچہ تعبیر سے نکلا

ہوں غالبؔ و اقبالؔ کہ فیضؔ و ظفرؔ اقبال
ہر رنگ سخن مکتبۂ میرؔ سے نکلا



○

جسے بھی ہوں اَدب آداب دیکھ سکتا ہے
کوئی بھی شخص ترے خواب دیکھ سکتا ہے

تری نگاہ سے دنیا کو دیکھنے والا
چراغ کو پسِ محراب دیکھ سکتا ہے

یہ کہہ کے اذنِ سفر دے دیا گیا مجھ کو
کہ تو ستارے کو مہتاب دیکھ سکتا ہے

دعا و اشک کی گٹھڑی سنبھال کر رکھنا
کسی بھی وقت وہ اسباب دیکھ سکتا ہے

وہ جس نے دیکھ لیا ہے اسے نظر بھر کے
پسِ غبار و تہہ آب دیکھ سکتا ہے

نہ اپنے ہجر میں پژمردہ پا کے خوش ہے ہمیں
نہ اپنے وصل میں شاداب دیکھ سکتا ہے

نہ چاہتا ہے کہ ہم حالت سکوں میں رہیں
نہ اپنے عشق میں بے تاب دیکھ سکتا ہے

جمالؔ جس کو بھی شک ہو ہماری باتوں پر
ہمارا حلقہ احباب دیکھ سکتا ہے



○

نہ کوئی فال نکالی نہ استخارہ کیا
بس ایک صبح یونہی خلق سے کنارہ کیا

نکل پڑیں گے گھروں سے تمام سیارے
اگر زمین نے ہلکا سا اِک اشارہ کیا

جو دل کے طاق میں تو نے چراغ رکھا تھا
نہ پُوچھ میں نے اسے کس طرح ستارہ کیا

پرائی آگ کو گھر میں اُٹھا کے لے آیا
یہ کام دل نے بغیر اُجرت و خسارہ کیا

عجب ہے تو کہ تجھے ہجر بھی گراں گزرا
اور ایک ہم کہ ترا وصل بھی گوارہ کیا

ہمیشہ ہاتھ رہا ہے جمالؔ آنکھوں پر
کبھی خیال کبھی خواب پر گزارہ کیا



مدّتوں بعد شبِ ماہ اُسے دیکھا تھا
پر کسی اور کے ہمراہ اُسے دیکھا تھا

کیا خبر تھی کہ کہانی کوئی بن جائے گی
میں نے کل بزم میں ناگاہ اُسے دیکھا تھا

وصل کی رات ستاروں نے بڑی حسرت سے
گاہ دیکھا تھا مجھے گاہ اُسے دیکھا تھا

لوگ اُسے ڈھونڈنے نکلے تو یہ معلوم ہوا
جس نے دیکھا تھا سرِ راہ اُسے دیکھا تھا

آج اِک عمر کے بعد اس سے ملا تھا لیکن
اپنے احوال سے آگاہ اُسے دیکھا تھا

اس کا کیا ٹھیک کہ لوگوں نے بیک وقت جمالؔ
سرِ میخانہ و درگاہ اُسے دیکھا تھا

○

کوئی موضوع ہو، تیرا حوالہ اچھا لگتا ہے
پھر اس کے بعد ہر چپ رہنے والا اچھا لگتا ہے

اِک ایسی بے نتیجہ جنگ لڑ کر آ رہا ہوں میں
کہ اب شمشیر سے بڑھ کر پیالہ اچھا لگتا ہے

بہت آرائشِ خانہ کے منصوبے بناتا ہوں
مگر کمرے کی چھت پر ایک جالا اچھا لگتا ہے

مجھے اچھا نہیں لگتا، زباں کو بند کر لینا
مگر بچوں کے ہاتھوں میں نوالہ اچھا لگتا ہے

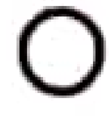
کبھی دل شاد رہتا ہے کسی کے ملتے رہنے سے
کبھی کوئی بچھڑ کر جانے والا اچھا لگتا ہے

عناصر سے الگ کر کے میں تجھ کو دیکھنا چاہوں
ترے ہمراہ سب کچھ لامحالہ اچھا لگتا ہے

اسی اک بات پر ہے اتفاق و اختلاف اُس سے
اسے آئینہ اور مجھ کو پیالہ اچھا لگتا ہے

وہ کوئی اور ہے، ہم میں سے ہرگز ہو نہیں سکتا
جسے اِس گھر سے باہر کا اُجالا اچھا لگتا ہے





اس کی محبتوں کا طریقہ کچھ اور ہے
کہتا وہ مجھ سے اور ہے کرتا کچھ اور ہے

جو اس پر بیتی ہے وہ معلوم ہے مجھے
جب اس سے پوچھتا ہوں بتاتا کچھ اور ہے

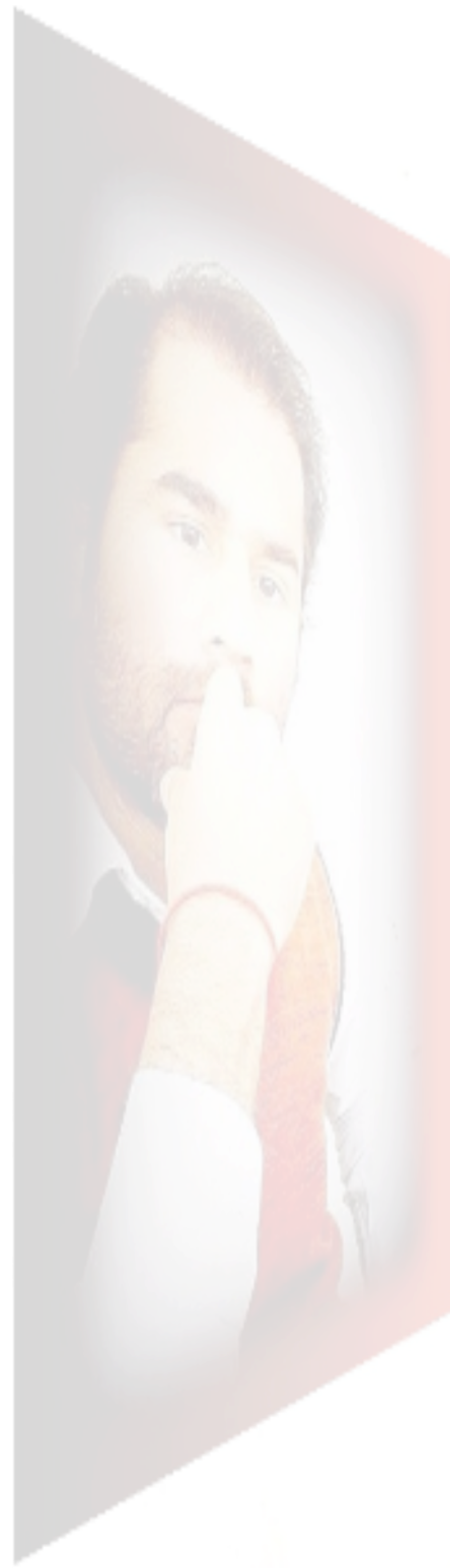
وہ بھی سمجھتا ہے کہ جدا کیوں ہوئے ہیں ہم
یہ میں بھی جانتا ہوں کہ قصہ کچھ اور ہے

پنچوں کی بات مان لیں کس طرح ہم کہ جب
میرے اور اس کے درمیاں جھگڑا کچھ اور ہے

اس کے بغیر چین بھی پڑتا نہیں جسے
سمجھاتا اور کچھ ہوں سمجھتا کچھ اور ہے

کر اے غزالِ عشق مرے شہرِ دل کی سیر
صحراؤں میں غبار اُڑانا کچھ اور ہے

یاروں سے ملتے جلتے رہا کیجئے جمالؔ
یاروں کے بیچ اِن دنوں چرچا کچھ اور ہے



○

اِس سے کوئی نہیں میری نگہبانی پر
یہ گھڑی سخت کڑی ہے ترے زندانی پر

باخبر کر کے رہ عشق کی مشکل سے تجھے
فیصلہ چھوڑ دیا ہے تری آسانی پر

نہ ہوا اور نہ مٹی پہ کبھی ہو پایا
جو بھروسا ہے مجھے بہتے ہوئے پانی پر

میں ابھی پہلے خسارے سے نہیں نکلا ہوں
پھر بھی تیار ہے دل دوسری نادانی پر

کسی بھی وقت بدل سکتا ہے لمحہ کوئی
اس قدر خوش بھی نہ ہو میری پریشانی پر

ختم ہونے کو ہیں اشکوں کے ذخیرے بھی جمال
روئے کب تک کوئی اس شہر کی ویرانی پر

○

یہ بات احاطہ اہل ہوس سے باہر ہے
یہاں وہی ہے کہ جو دسترس سے باہر ہے

اسی کا نام ہے دنیا کہ یاں کسی کے کبھی
نہ اختیار میں کچھ ہے نہ بس سے باہر ہے

درست ہے کہ میں ناکام وصل ہوں تیرا
مگر یہ بات ترے پیش و پس سے باہر ہے

کسی کو اس کی رہائی کا غم نہیں ورنہ
رہا تو وہ بھی نہیں جو قفس سے باہر ہے

زمین پاک تری بوئے خاک سے نمناک
کوئی ترے لیے کتنے برس سے باہر ہے

○○○

یہ سوچ کے ہر صبح نکل پڑتے ہیں گھر سے
سر آئے ہمارے کوئی الزام کم از کم

○

اس بار تو غرور ہنر بھی نکل گیا
بچ کر وہ مجھ سے بار دگر بھی نکل گیا

اتنا ترا وصال تو چاہا نہ تھا کبھی
دل سے تری جدائی کا ڈر بھی نکل گیا

ہم راہ کے تعین جانکاہ میں رہے
اس کشمکش میں وقت سفر بھی نکل گیا

مقصود صرف ڈھونڈنا کب تھا تجھے سو میں
جس سمت تو نہیں تھا ادھر بھی نکل گیا

کہتا نہ تھا میانہ روی ہے بری جمالؔ
صحرا کے ساتھ، ہاتھ سے گھر بھی نکل گیا

○○○

بڑا عذاب ہے ہونٹوں پہ بات آئی ہوئی
ادھر زبان سے نکلی ادھر پرائی ہوئی

○

دل میں یاد رفتگاں آباد ہے
ورنہ یہ دل بھی کہاں آباد ہے

ایک میں آباد ہوں اس شہر میں
اور اک میرا مکاں آباد ہے

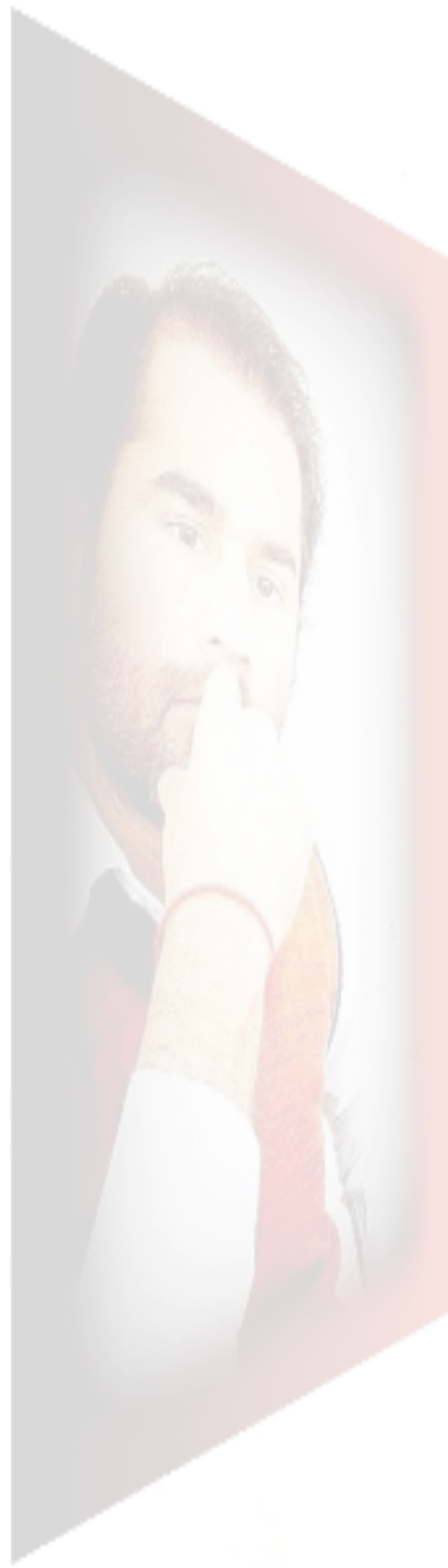
کس کے یہ نقش قدم ہیں خاک پر
کون ایسے میں یہاں آباد ہے

باب عمر رائگاں کی لوح پر
حرف احساس زیاں آباد ہے

میرے ہونے سے نہ ہونا ہے مرا
آگ جلنے سے دھواں آباد ہے

رونق دل کا ہے عالم دیدنی
خانہ آوارگاں آباد ہے

اک دریچہ اس گلی میں آج تک
بے چراغ و بے نشاں آباد ہے



○

جب اپنی روح کے احوال میں شامل نہیں سمجھا
تعلق توڑنے کے بھی اسے قابل نہیں سمجھا

عجب در تھا نہ کھلنے پر بھی اس کا فیض جاری تھا
عجب خیرات تھی جس کو کوئی سائل نہیں سمجھا

سبھی سمجھے مجھے اس سے جدا ہونے کی جلدی تھی
کوئی بھی دیکھنے والا مری مشکل نہیں سمجھا

محبت کے سوا بھی ہیں بہت سے مسئلے اس کے
دماغ اس بات کو سمجھا ہے لیکن دل نہیں سمجھا

کبھی اس آسماں کی دلکشی میں گم نہیں ہوتا
کبھی سوئے ہوئے دشمن کو میں غافل نہیں سمجھا

ooo

مچل گیا تھا یہ دل دیکھ کر اسے سر راہ
سو میں بھی آ گیا باتوں میں اس کمینے کی

○

خود اس نے تعلق ہی کوئی جب نہیں رکھا
پھر میں نے بھی اس شخص سے مطلب نہیں رکھا

ہر عہدہ ہوا پیش مگر عشق میں ہم نے
جز در بدری کوئی بھی منصب نہیں رکھا

رخصت کی اجازت نہ ملی اس سے وگرنہ
سامان کو باندھے ہوئے میں کب نہیں رکھا

دل میں نہ تری یاد کو کس روز سجایا
آنکھوں میں ترے خواب کو کس شب نہیں رکھا

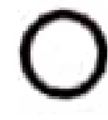
اس نے بھی بہت ڈھونگ رچائے تھے وفا کے
میں نے بھی اٹھا کر کوئی کرتب نہیں رکھا

کب عشق میں ہم لمحۂ کمزور سے گزرے
کب پیش ترے خود کو مودب نہیں رکھا

خود نہر نکالی ہے تو پھر پیاس بجھائی
بہتی ہوئی گنگا پہ کبھی لب نہیں رکھا

کچھ باپ کا سایہ بھی بہت جلد اٹھا تھا
کچھ گردشِ دوراں نے مہذب نہیں رکھا





میں جو کل پیرہن خاک بدل کر آیا
وہ بھی ملنے نئی پوشاک بدل کر آیا

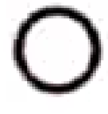
اے زمیں زاد تری رفعتیں چھونے کے لئے
تجھ تلک میں کئی افلاک بدل کر آیا

اس کو راس آئی ہے یہ بزم جہاں' جو بھی یہاں
اپنا پیمانہ ادراک بدل کر آیا

عشق میں کوئی تکلف کی ضرورت تو نہیں
پھر وہ کیوں دیدہ نمناک بدل کر آیا

ہم سے کر بے سروسامانی ہجرت پہ سوال
اس سے مت پوچھ جو املاک بدل کر آیا

بے سبب تو نہ رہا عرصہ دنیا میں قیام
میں مزاج خس و خاشاک بدل کر آیا



اس آنکھ کی تحویل میں رہتے ہیں ہمیشہ
ہم خواہش تکمیل میں رہتے ہیں ہمیشہ

کیسے ہیں بھلا یہ ترے عشاق ہمہ وقت
فکر غم تعطیل میں رہتے ہیں ہمیشہ

اس خاک پہ میں اور سر افلاک ستارے
اک حکم کی تعمیل میں رہتے ہیں ہمیشہ

خود کو نہ ہو محسوس، پہ چہرے کے خط و خال
اک عالم تبدیل میں رہتے ہیں ہمیشہ

کوئی سا بھی موسم ہو سر چشم محبت
کچھ عکس مگر جھیل میں رہتے ہیں ہمیشہ

مبہم مجھے رہنے دے کہ ابلاغ کے جھگڑے
اظہار کی تفصیل میں رہتے ہیں ہمیشہ

○

اپنے ہمراہ جلا رکھا ہے
طاق دل پہ جو دیا رکھا ہے

جنبش لب نہ سہی تیرے خلاف
ہاتھ تو ہم نے اٹھا رکھا ہے

تو مجھے چھوڑ کے جا سکتا نہیں
چھوڑ اس بات میں کیا رکھا ہے

وہ ملا دے گا ہمیں بھی جس نے
آب اور گل کو ملا رکھا ہے

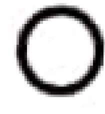
مجھ کو معلوم ہے میری خاطر
کہیں اک جال بنا رکھا ہے

جانتا ہوں مرے قصہ گو نے
اصل قصے کو چھپا رکھا ہے

رات نے اپنی گواہی کے لیے
اک ستارے کو بچا رکھا ہے

کام کچھ اتنے ہیں کرنے کو جمالؔ
نام کو کل پہ اٹھا رکھا ہے





اس رمز پر وہ آئنہ شرمندہ تھا مرا
میں مر چکا تھا عکس مگر زندہ تھا مرا

ترتیب دینا ہوں گی پھر اپنی صفیں مجھے
دشمن سے جا ملا جو نمائندہ تھا مرا

بے قیمتی کا رنج نہیں سانحہ یہ ہے
اب کے مرا غلام فروشندہ تھا مرا

اچھا ہوا کہ زندہ نہیں ہیں مرے بزرگ
حاکم بنا ہوا ہے جو کارندہ تھا مرا

جب میرے فیصلے پہ کیے اس نے دستخط
میں چپ رہا کہ لمحہ آئندہ تھا مرا

اس نے کیا خدا کو ملوث مرے خلاف
قاتل کہ ہر لحاظ سے شرمندہ تھا مرا

اس بار تو نشان عبادت کی شکل میں
اس کی جبیں پہ زخم درخشندہ تھا مرا

دیتا تھا بددعائیں مجھے ہر نماز میں
اور جانماز وقت پہ شرمندہ تھا مرا

میں بن رہا تھا جب ہدف منصف و وکیل
اک عہد سرفروش یہاں زندہ تھا مرا

یہ کہہ کے چاند لوٹ گیا پھر مدار میں
اس سرزمین پر کوئی باشندہ تھا مرا

000

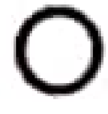
مجھے بدلتے ہوئے وقت نے جو بخشے تھے
وہ زخم رسنے لگے تیری مسکراہٹ سے

○

میں نے اس شخص کی یاری کو ضروری جانا
اس نے بس وقت گزاری کو ضروری جانا

میں نے اس حسن کی تفصیل سے پرہیز کیا
اس نے مضمون نگاری کو ضروری جانا

مر رہا تھا مرا دشمن سو اسی دم میں نے
آخری ضربت کاری کو ضروری جانا



زنجیر ہلانے کی اجازت نہیں ملتی
یوں تو در انصاف کو عزت نہیں ملتی

اقرار نہ کرنا بھی بہت ہے کہ ہمیں تو
انکار بھی کرنے کی سہولت نہیں ملتی

محنت سے پسینے کو محبت میں بہاؤں
اور اس پہ بھی اتراؤں کہ اجرت نہیں ملتی

جھوٹوں کے بہت کار محبت میں مزے ہیں
میں سچ ہوں جبھی مجھ کو رعایت نہیں ملتی

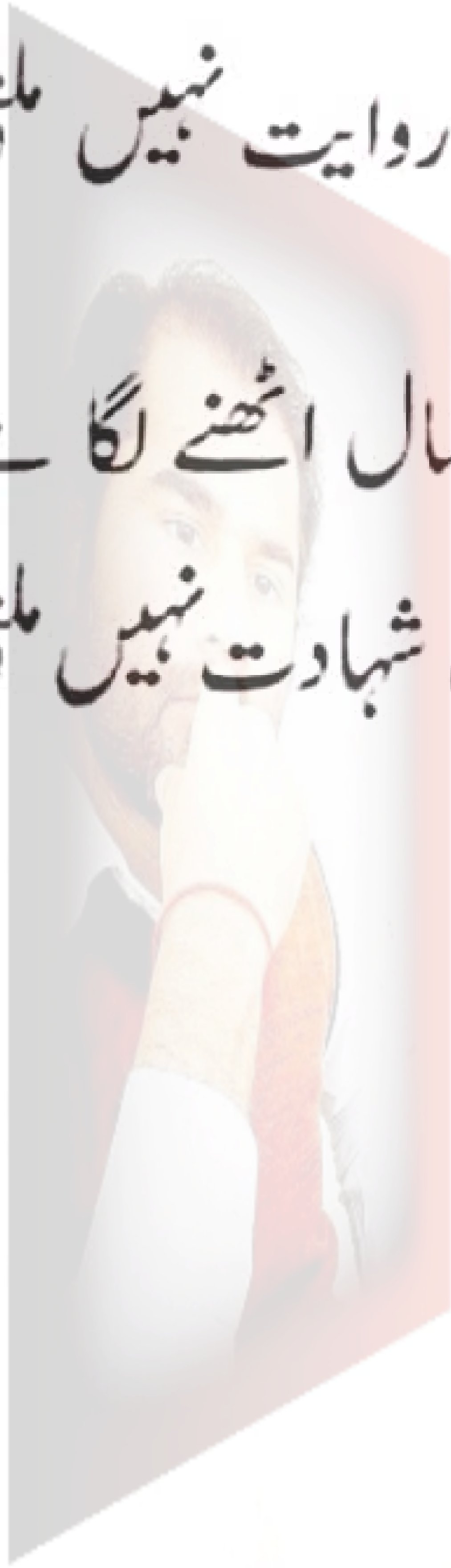
یہ بات بری ہے مگر آباد گھروں سے
ہم خانہ خرابوں کی طبیعت نہیں ملتی

جلتے ہوئے ہر دیپ میں روشن ہے مرا عکس
تجھ میں ترے ہونے کی علامت نہیں ملتی

مصروف رکھا مجھ کو سدا عشق نے تیرے
دیکھوں میں تری سمت یہ فرصت نہیں ملتی

آمادہ نہیں جاں سے گزرنے پہ سرِ عشق
ایسا بھی نہیں ہے کہ روایت نہیں ملتی

خود پر سے بھروسا ہی جمال اٹھنے لگا ہے
کوئی بھی مرے حق میں شہادت نہیں ملتی



○

دیدنی ہوگا سرِ جنگ در و بست مرا
تازہ دم میں بھی ہوں دشمن بھی زبردست مرا

کچھ تو گہنایا ہوا ہے مری تدبیر کا چاند
کچھ ہے گردش میں ستارہ بھی سرِ دست مرا

میرے ہاتھوں میں تری موت بھی ہے زیست بھی ہے
تیری گردن میں ابھی تیر ہے پیوست مرا

مسئلہ اپنی بقا کا بھی تھا درپیش اسے
فیصلہ کرنا پڑا اس کو بہ یک جست مرا

گرمیِ خوں گئی ہتھیار ترے پھینکنے سے
حوصلہ تجھ کو ہرانے سے ہوا پست مرا

ooo

مجھ کو سائے کی نہیں تیری طلب ہے میرے دوست
دیکھ کتنا دور بیٹھا ہوں تری دیوار سے

○

سب لوگ سمجھتے ہیں ستم گر کے علاوہ
کچھ اور ٹھکانے بھی ہیں اس گھر کے علاوہ

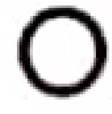
یہ بات ترے عشق نے سمجھائی کہ دنیا
کچھ اور ہے محروم و میسر کے علاوہ

کس طرح مورخ کا قلم ان کو لکھے گا
جو رنج ہیں پسپائی لشکر کے علاوہ

بے چینی ہے جو سرحد افلاک و زمیں پر
کچھ اور بھی جھگڑے ہیں سمندر کے علاوہ

اک یاد بھی ہمراہ سفر میں ہے ہمارے
آنکھوں سے بچھڑتے ہوئے منظر کے علاوہ

کیا دکھ ہے جمال آپ کو پوچھا نہ کسی نے
ملتے ہی نہیں اب تو کہیں گھر کے علاوہ



سبھی کھڑے تھے شریک زمانہ ہوتے ہوئے
کسی نے روکا نہ گھر سے روانہ ہوتے ہوئے

چراغ بجھتے چلے جا رہے ہیں سلسلہ وار
میں خود کو دیکھ رہا ہوں فسانہ ہوتے ہوئے

اچانک ایک ستارہ فلک سے ٹوٹ گیا
مرے بھی شامل بزم شبانہ ہوتے ہوئے

مرا ہمیشہ ان الفاظ پر یقین رہا
جو منکشف ہوئے لب سے ادا نہ ہوتے ہوئے

اسی طرح کے ہیں جتنے بھی دکھ ہمارے ہیں
سروں پہ چھاؤں نہیں شامیانہ ہوتے ہوئے

مرا بھی نام ہے فہرست مجرماں میں لکھا
میں دیکھتا رہا خالی خزانہ ہوتے ہوئے

پرند لوٹ کے آنے ہی پر نہیں راضی
کوئی تو بات ہے جو آشیانہ ہوتے ہوئے

عجب وہ لوگ تھے آزار بھی' عجب ان کے
زمین چھوڑ گئے آب و دانہ ہوتے ہوئے

یہاں تو خستگی بام و در پہ چپ ہیں سبھی
کوئی تڑپتا ہے بیرون خانہ ہوتے ہوئے

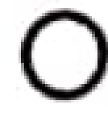
مرا کمال کہ میں اس فضا میں زندہ ہوں
دعا نہ ملتے ہوئے اور ہوا نہ ہوتے ہوئے

حریف تھا مرے دشمن کا وہ مگر میں نے
جمال کی نہیں بیعت' بہانہ ہوتے ہوئے



عجیب بھول بھلیوں کے درمیاں آئی
وہ ایک یاد کہ بے نام و بے نشاں آئی

جہاں جہاں نہیں پہنچا غبا ر راہ ترا
وہاں وہاں یہ زمیں زیر آسماں آئی



ہمراہ تیرے منصب و لشکر ضرور ہے
لیکن شکست تیرا مقدر ضرور ہے

گردش میں آج میرے ستارے ہیں گر تو کیا
تیرا بھی ایک وقت مقرر ضرور ہے

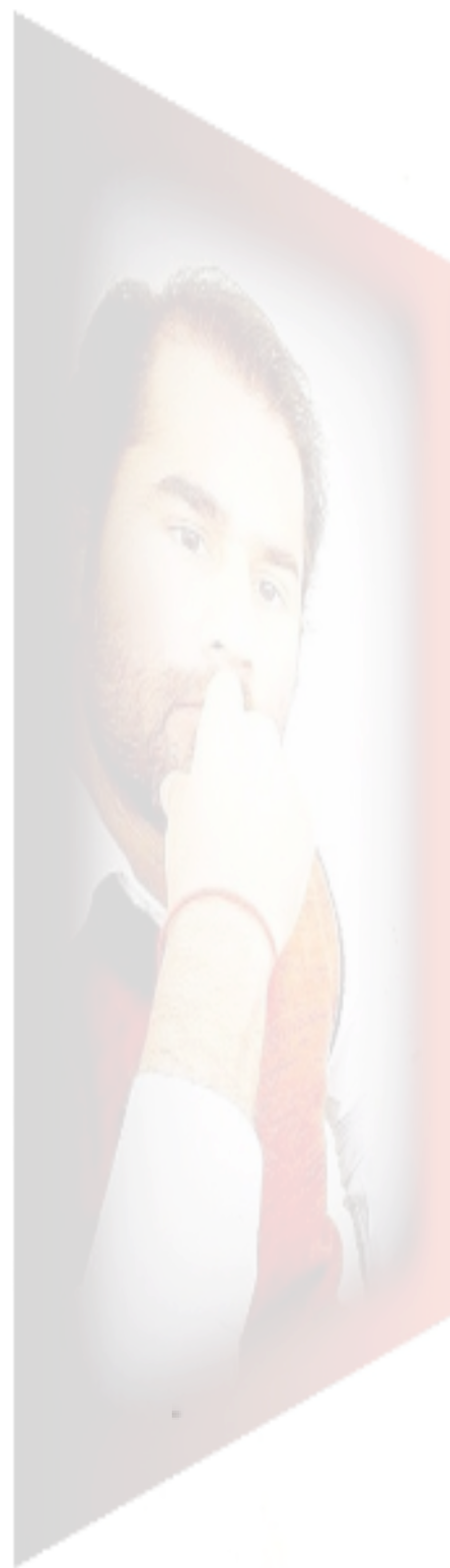
کیا ہے، یہ مجھ کو علم نہیں ہو سکا ابھی
کچھ ہے کہ جو بساط سے باہر ضرور ہے

رہتا یونہی نہیں ہے، تہ و بالا یہ نظام
اس کائنات میں کوئی چکر ضرور ہے

یہ حکم ہے کہ کوئی بنائے نہ کشتیاں
اس شہر کے کنارے سمندر ضرور ہے

قدر دل مہاجر خستہ کرو کہ یہ
بے شجرہ نسب نہیں بے گھر ضرور ہے

شاید سمجھ گیا' وہ در و بست خانہ سے
اس گھر میں کوئی دوسرا بستر ضرور ہے



○

پھر کوئی ملال ہی غلط ہے
جب صورت حال ہی غلط ہے

یہ گھر ہے اگر تو ایسے گھر میں
رہنے کا خیال ہی غلط ہے

اس عالم خاک میں کسی کی
دراصل مثال ہی غلط ہے

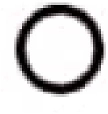
یا واقعی بے نیاز ہے وہ
یا دست سوال ہی غلط ہے

کیا تجھ سے گلہ کریں کہ تیرا
آئین وصال ہی غلط ہے

اک تیرا ہی واقعہ نہیں کچھ
مجھ پر تو یہ سال ہی غلط ہے

اس میرے مکاں کی داستاں کا
بنیادی خیال ہی غلط ہے





نیت نہ تھی سفر کی، ہوا بھی خلاف تھی
مجبور تھے کہ گھر کی فضا بھی خلاف تھی

میں پھر بھی جسم ہی میں رہا جب تلک رہا
موسم کے ساتھ ساتھ قبا بھی خلاف تھی

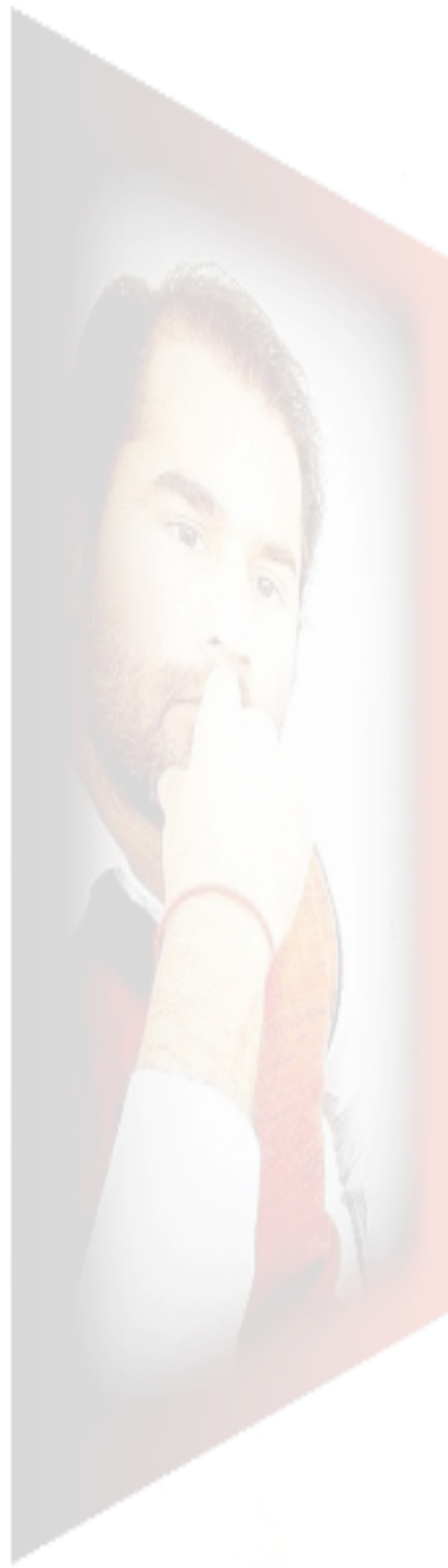
منصف کا فیصلہ تھا محل نظر مگر
چپ ہو گیا کہ خلق خدا بھی خلاف تھی

اندر بھی اٹھ رہا تھا ہر اک دست اختلاف
باہر سے آنے والی صدا بھی خلاف تھی

اس خاکداں میں پھر بھی رہا کروفر کے ساتھ
خالی تھی جو یہاں وہ جگہ بھی خلاف تھی

کچھ بادِ انتقام تھی زوروں پہ اور کچھ
تقدیر ہر لباس و ردا بھی خلاف تھی

جب شہر چھوڑ کر مجھے جانا پڑا جمالؔ
اس شب فضائے دشت بلا بھی خلاف تھی



○

خدا ہی آپ نہ جب تک زمیں پہ اترے گا
تو کون پورا کسی کے یقیں پہ اترے گا

یہ سیل اشک بھی اپنا ہے آنکھ بھی اپنی
کھڑے رہو کہ یہ دریا یہیں پہ اترے گا

مری نگاہ سمجھ میرے پیرہن پہ نہ جا
مکاں کا رنگ ہے، یہ تو مکیں پہ اترے گا

بھروسا کوئی نہیں ہے کسی مسافر کا
جہاں بھی ریل رکے گی وہیں پہ اترے گا

چلے تو ہو سفر عشق پر خیال رہے
کہیں چڑھے گا یہ دریا کہیں پہ اترے گا

غروب ہونے سے پہلے ستارہ سحری
کسی کے صحن کسی کی جبیں پہ اترے گا

ہجوم کم نظراں کر رہا ہے پھر تائید
عذاب پھر کسی گوشہ نشیں پہ اترے گا

تمام خاک نشیں زیرِ خاک ہوں گے مگر
لہو کا رنگ آستیں پہ اترے گا

یہاں بھرے ہوئے بیٹھے ہیں سب بندھے ہاتھوں
سو اب یہ غصہ ترے جانشیں پہ اترے گا

جمالِ خطہ دل ہو بھی جائے گر ہموار
کوئی جہاز نہ اس سرزمیں پہ اترے گا

ooo

ہار جانے پہ لوگ کہتے ہیں
کون جھگڑا کرے مقدر سے



○

کیا اور سزا دے گا زیادہ سے زیادہ
وہ مجھ کو بھلا دے گا زیادہ سے زیادہ

اس آتشِ فرقت کے مقدر میں ہے بجھنا
کتنی وہ ہوا دے گا زیادہ سے زیادہ

رونا تو حضور اس کے ہی رونا کہ وہ آنسو
مٹی میں ملا دے گا زیادہ سے زیادہ

○

رات آتی رہتی ہے دن نکلتا رہتا ہے
اور خدا کے بندوں کا کام چلتا رہتا ہے

پھر رہا ہوں بستی میں یہ پتا لیے کب سے
اک چراغ اس گھر میں دن کو جلتا رہتا ہے

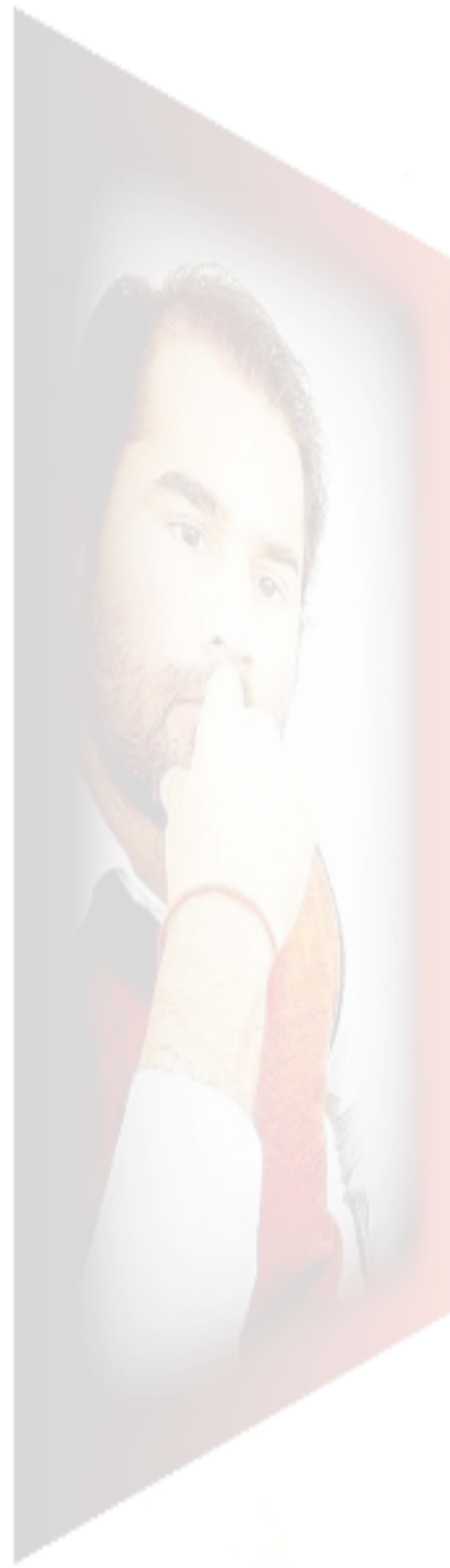
ایک گھر ہے میں جس میں رہتا ہوں خوش و خرم
ایک بات ہے جس سے دل دہلتا رہتا ہے

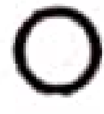
میں بھی آسمانوں میں روز اضافہ کرتا ہوں
وہ بھی ان زمینوں کا رخ بدلتا رہتا ہے

زیست کی تمازت میں شاخ مرگ سے آگے
راہرو ٹھہرتا ہے رستہ چلتا رہتا ہے

عشق کرنے والوں کو صرف یہ سہولت ہے
کچھ نہ کرنے سے بھی کچھ دل بہلتا رہتا ہے

میں بساط دنیا کو جب لپیٹ دیتا ہوں
کوئی دوسرا مجھ میں گھر بدلتا رہتا ہے





خدا نے خوش مجھے اوقات سے زیادہ کیا
کہ ہاتھ تنگ رکھا اور دل کشادہ کیا

محیط چاروں طرف ایک اسم ہے جس نے
نظر میں رنگ بھرے آئنے کو سادہ کیا

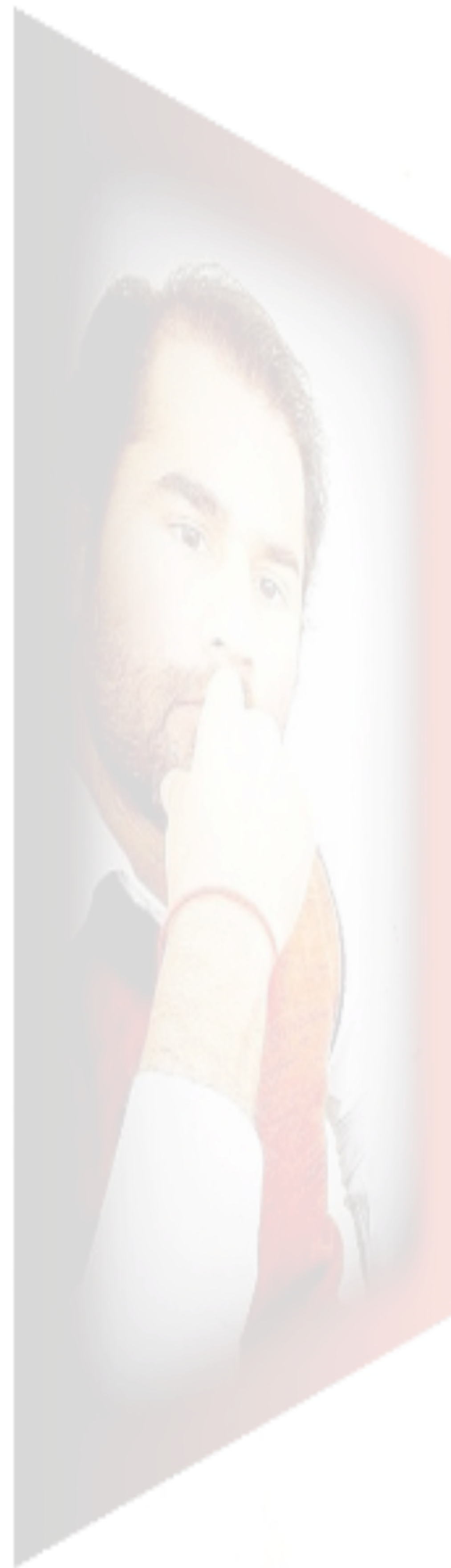
کبھی فلک کبھی دھرتی نے دی پناہ مجھے
کبھی خدا سے کبھی خود سے استفادہ کیا

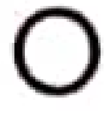
ازل سے اس کا گرفتار عشق ہوں جس نے
دیے کو روشنی میں چاند سے زیادہ کیا

بس ایک سطح یقیں پر رہے ہمیشہ ہم
نہ میں نے عرض کبھی کی نہ اس نے وعدہ کیا

ترا کرم کہ کوئی کام آ پڑا اس دم
میں جب کبھی ترے انکار کا ارادہ کیا

مرے خدا نے مرا رزق مجھ کو پہنچایا
جمالؔ گھر سے نکلنے کا جب ارادہ کیا





اُنہی کے واسطے بزم جہاں سجائی گئی
دیا جلایا گیا اور ہوا چلائی گئی

اُنہی کے نام پہ باران و خاک جمع ہوئے
شجر اگائے گئے شاخِ گُل سجائی گئی

انہی کے چلنے کو یہ آسماں بنایا گیا
اُنہی کے بیٹھنے کو یہ زمیں بچھائی گئی

انہوں نے روح کو دوڑا دیا ہر اک شے میں
یہ کائنات جب انؑ کے حضور لائی گئی

کمال ہے یہ اُسی اِسمؑ کا کہ آج تلک
نہ تابِ خامہ نہ تاثیرِ روشنائی گئی

وہ شہر دیکھ تو آیا مگر یہ سوچتا ہوں
یہ میں گیا تھا کہ میری شکستہ پائی گئی

دل سیاہ سے لے کر دماغ کی حد تک
جہاں بھی آپ گئے ہیں وہاں خدائی گئی

نگاہ ڈالی گئی اس جہانِ خستہ پر
جمالِ عزتِ کون و مکاں بڑھائی گئی



○

شاہ زماں کا تذکرہ کرنے کا وقت ہے
یہ وقت ہی تو جاں سے گزرنے کا وقت ہے

گھر سے مسافروں کے نکلنے کی ہے گھڑی
راہوں میں خوشبوؤں کے بکھرنے کا وقت ہے

اس وقت ایک دھیان ہے اور ان کا دھیان ہے
یہ وقت دل کو آئنہ کرنے کا وقت ہے

اے راہ شوق مجھ کو پہنچنے کی ہے لگن
چلنے کا وقت ہے نہ ٹھہرنے کا وقت ہے

وہ وقت ہے اذان میں اس نام کے لیے
تصویر میں جو رنگ کے بھرنے کا وقت ہے

باشندگان ارض وطن پر جمالؔ اب
اللہ کے رسولؐ سے ڈرنے کا وقت ہے

○

شاہ زماں کا تذکرہ کرنے کا وقت ہے
یہ وقت ہی تو جاں سے گزرنے کا وقت ہے

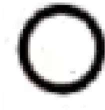
گھر سے مسافروں کے نکلنے کی ہے گھڑی
راہوں میں خوشبوؤں کے بکھرنے کا وقت ہے

اس وقت ایک دھیان ہے اور ان کا دھیان ہے
یہ وقت دل کو آئنہ کرنے کا وقت ہے

اے راہِ شوق مجھ کو پہنچنے کی ہے لگن
چلنے کا وقت ہے نہ ٹھہرنے کا وقت ہے

وہ وقت ہے اذان میں اس نام کے لیے
تصویر میں جو رنگ کے بھرنے کا وقت ہے

باشندگانِ ارضِ وطن پر جمالؔ اب
اللہ کے رسولؐ سے ڈرنے کا وقت ہے



سبزے سے کچھ لگاؤ نہ سوسن سے عشق ہے
آوارہ خاطری کو نشیمن سے عشق ہے

ہے چشم انتظار کی رونے سے برکتیں
اس دشت کے خمیر میں ساون سے عشق ہے

پوچھا تھا چارہ ساز نے عمر مرض ہے کیا
تیماردار بولے کہ بچپن سے عشق ہے

تیرے ہجوم سینہ فگاراں میں پیش پیش
وہ بھی تو ہیں جنہیں ترے دشمن سے عشق ہے

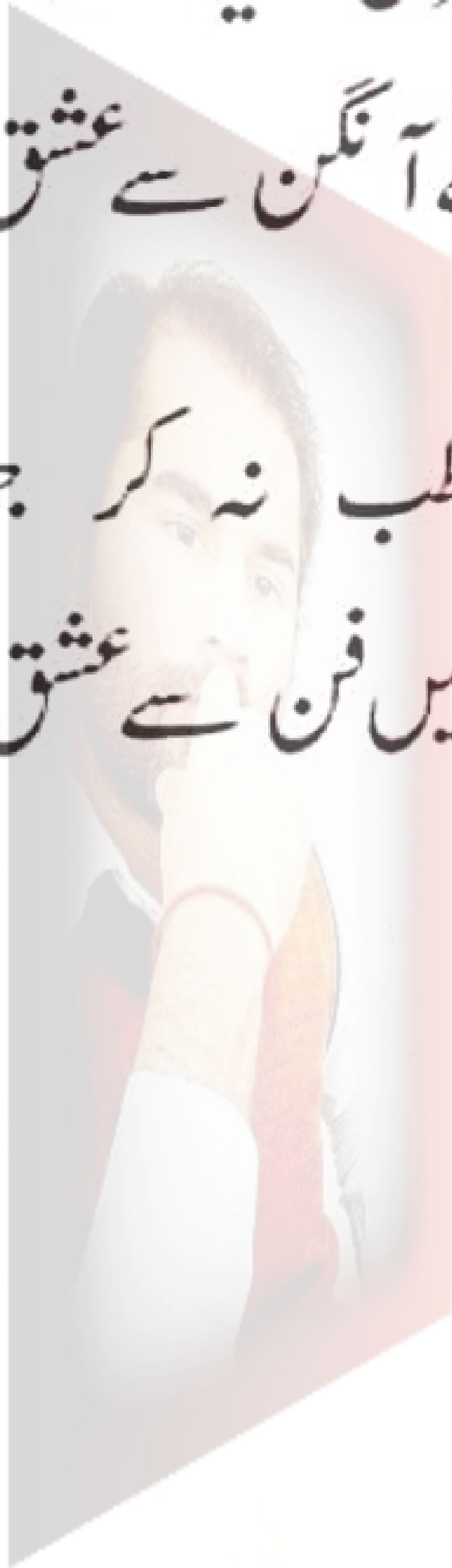
کس پر تری نگاہ پڑی کس پہ لب ہلے
یہ ان کا غم نہیں جنہیں درشن سے عشق ہے

دل کا یہ کہہ کے اس سے تعارف کرایا میں
یہ شہر کا مکین ہے اور بن سے عشق ہے

اس کو نہیں ہے کام چراغ و ستارہ سے
جس آنکھ کو ترے رخ روشن سے عشق ہے

معمار شہر نو کو غرض کیا کہ سوچتا
کس گھر بسے گا وہ جسے آنگن سے عشق ہے

ہر رہرو سخن کو مخاطب نہ کر جمالؔ!
ان سے کلام کر کہ جنہیں فن سے عشق ہے



○

روز ازل سے خوگر سیلاب گریہ ہے
شہر شکستہ دل کہ لب آب گریہ ہے

کیا اس پر التفات جو بیتاب گریہ ہے
یہ دیکھ کون واقف آداب گریہ ہے

ہو تیرا حسن یک دو نفس یا مرا چراغ
جو کچھ بھی اس جگہ ہے وہ اسباب گریہ ہے

دامان عشق میں ہیں ثمر ہائے وصل و ہجر
یہ کشت جیب و آستیں شاداب گریہ ہے

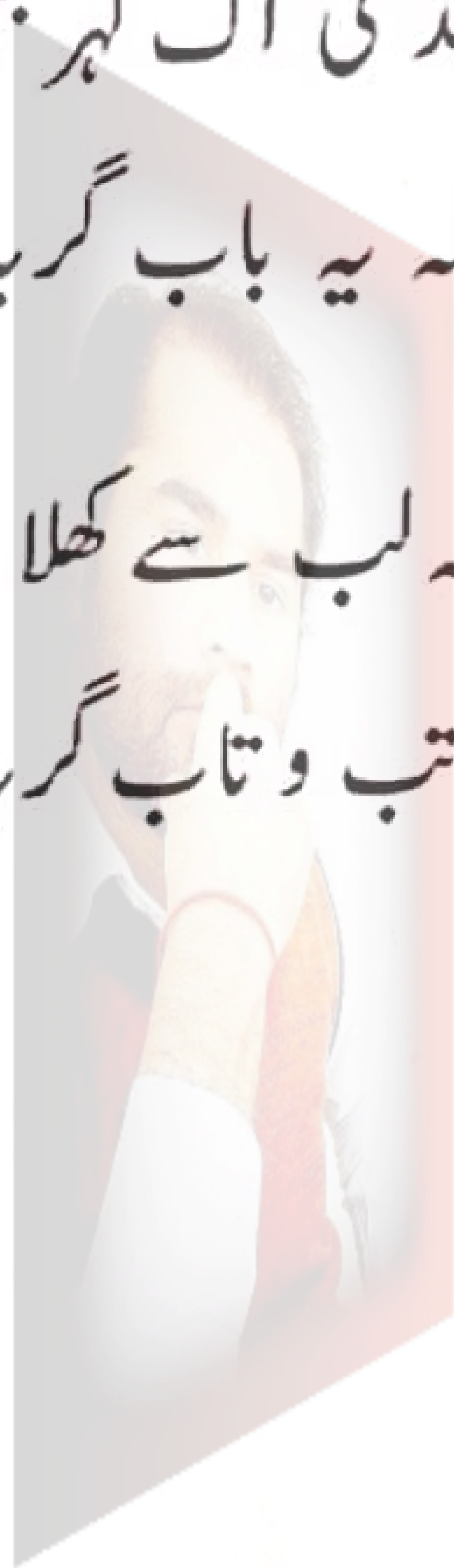
عالم وہ عشق میں ہے کہ معلوم ہی نہیں
تعبیر گریہ ہے کہ مجھے خواب گریہ ہے

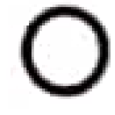
قدموں میں تیرے چادر خورشید ہے تو کیا
بالائے سر ہمارے بھی مہتاب گریہ ہے

بجھتا نہیں جو اشک فروزاں ہو ایک بار
وہ آنکھ ہر لحاظ سے محراب گریہ ہے

آئے گی غم میں نیند کی اک لہر بھی مگر
پلکیں نہیں جھپکنا کہ یہ باب گریہ ہے

یہ راز اس کے بوسہ لب سے کھلا جمالؔ
رخسار و چشم کیا ہیں تب و تاب گریہ ہے





دنیا میں وہی کچھ ہے مری کار گزاری
جو عمر سرِ کوچہ دلدار گزاری

ہم کو بھی شرف بخش کبھی دربدری کا
اس آنکھ سے یہ عرض کئی بار گزاری

دل وار دیا اس کے در و بام پہ میں نے
جاں نذر سرِ سایہ دیوار گزاری

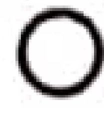
گو ٹوٹ گئے سارے تعلق، پہ ہے باقی
اس شخص سے اک رشتہ اظہار گزاری

آج اس سے ملے ہیں تو یہ محسوس ہوا ہے
جتنی بھی گزاری ہے وہ بے کار گزاری

خود ہی سے کبھی ہار، کبھی جیت گیا میں
خود ہی سے سدا برسر پیکار گزاری

ہر آن میں مصروف محبت رہا لیکن
لکھی ہی نہیں اس نے مری کارگزاری

اس دل کی زمیں سیر گہہ عشق ہے ایسی
تعطیل یہاں اس نے کئی بار گزاری



سب پھول ترے زخم ہمارے ہیں کم و بیش
افلاک پہ جتنے بھی ستارے ہیں کم و بیش

اک تیرے تغافل کو خدا رکھے وگرنہ
دنیا میں خسارے ہی خسارے ہیں کم و بیش

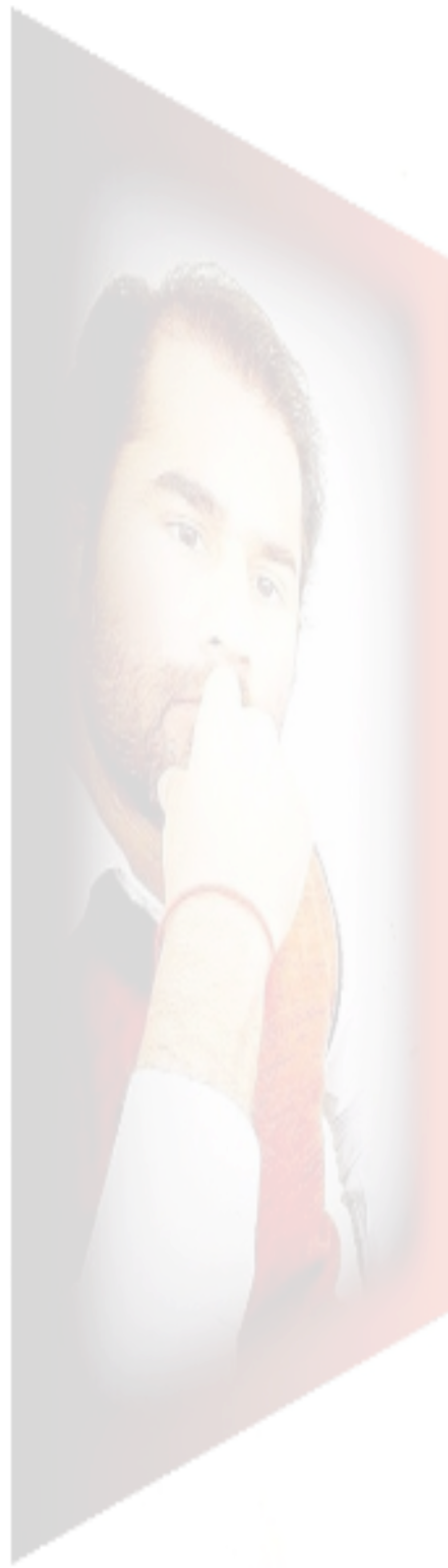
وہ جس جگہ مارے گئے اجداد ہمارے
ہم بھی اسی دریا کے کنارے ہیں کم و بیش

موسم کی گھٹن ہو کہ زمانے کا چلن ہو
سب تیرے بچھڑنے کے اشارے ہیں کم و بیش

یہ آنکھیں اگر ہیں تو بہت کم ہیں یہ آنکھیں
ہر سمت یہاں تیرے نظارے ہیں کم و بیش

سب عشق میں اندازے غلط نکلے ہمارے
جو شرط لگائی ہے وہ ہارے ہیں کم و بیش

اس گھر کی فضا نے مجھے مانا نہیں اب تک
پینتیس برس جس میں گزارے ہیں کم و بیش



○

سویرا ہو بھی چکا اور رات باقی ہے
ضرور دل میں ابھی کوئی بات باقی ہے

یہ لوگ کس قدر آرام سے ہیں بیٹھے ہوئے
اگرچہ ہونے کو اک واردات باقی ہے

کچھ اور زخم محبت میں بڑھ گئی ہے کسک
یہ سوچ کر کہ ابھی تو حیات باقی ہے

یہ غم جدا ہے بہت جلد باز تھے ہم تم
یہ دکھ الگ ہے ابھی کائنات باقی ہے

جو میری تیری ملاقات کا سبب تھا کبھی
وہ لمحہ تیرے بچھڑنے کے ساتھ باقی ہے

تمام بیڑیاں تو کاٹ ڈالی ہیں لیکن
جمالؔ قید نفس سے نجات باقی ہے

○

ہر چند آنکھ تھی سرِ منظر لگی ہوئی
کیا بولتا کہ مہر تھی لب پر لگی ہوئی

اس کی تپش نے اور بھی سلگا رکھا ہے کچھ
جو آگ ہے مکان سے باہر لگی ہوئی

سنتے ہیں اس نے ڈھونڈ لیا اور کوئی گھر
اب تک جو آنکھ تھی ترے در پر لگی ہوئی

پہچان کی نہیں ہے یہ عرفان کی ہے بات
تختی کوئی نہیں مرے گھر پر لگی ہوئی

کیسے قرار ہو کہ سوالوں کی ایک بھیڑ
مدت سے شہرِ دل کے ہے اندر لگی ہوئی

اب کے بہار آنے کے امکان ہیں کہ ہے
ہر پیرہن پہ چشم رفوگر لگی ہوئی

اس بار طول کھینچ گئی جنگ اگر تو کیا
اس بار شرط بھی تو ہے بڑھ کر لگی ہوئی

منحوس ایک شکل ہے جس سے نہیں فرار
پرچھائیں کی طرح سے برابر لگی ہوئی





کبھی جو دور کا منظر بلانے لگتا ہے
وہیں پہ مجھ کو مرا گھر بلانے لگتا ہے

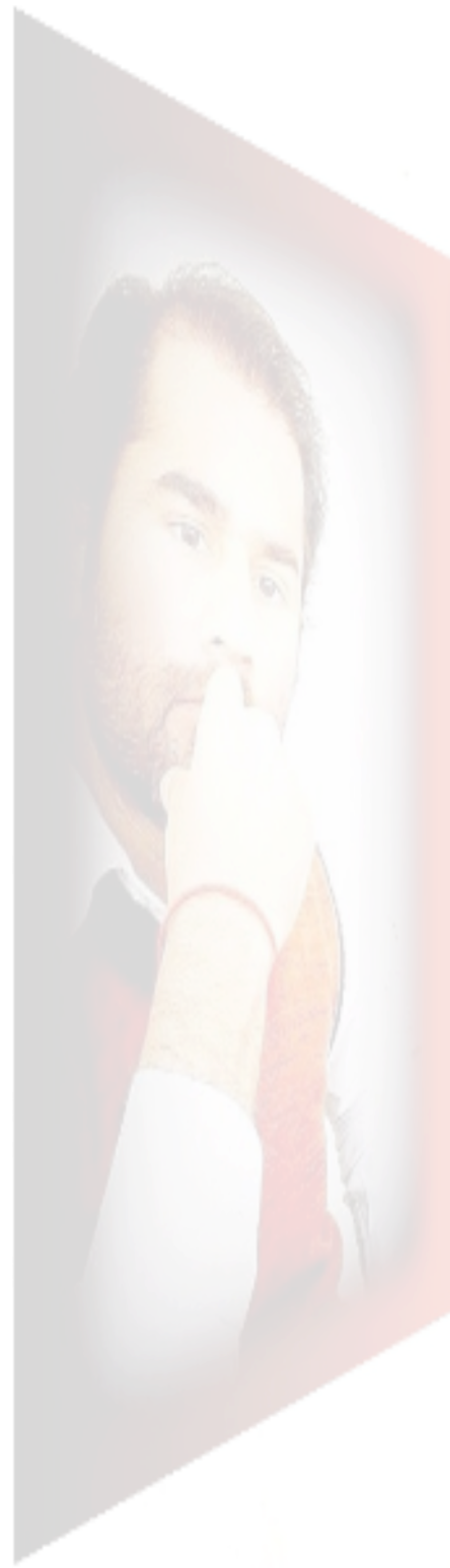
درونِ ذات جب اک اسم کھینچتا ہے مجھے
وہ کون ہے کہ جو باہر بلانے لگتا ہے

کبھی دریچے میں روشن کرے ستارے کو
کبھی وہ شمع بجھا کر بلانے لگتا ہے

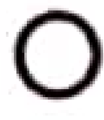
وہ آنکھ اپنی طرف ایسے کرتی ہے مائل
ہوا کو جیسے سمندر بلانے لگتا ہے

جو روز رات کو لاتا ہے میرے گھر مجھ کو
علی الصباح وہ آ کر بلانے لگتا ہے

جمالؔ پاؤں نکلتے ہیں جب بھی چادر سے
زمین میں ہے جو بستر بلانے لگتا ہے



وصل ہو یا ہجر کچھ بھی ہو جمالؔ
عشق ہے تو نفع کیا نقصان کیا



نئے جہان کا درباز کرنے والی ہے
یہ روح جسم سے پرواز کرنے والی ہے

چراغ بھی مرے ہاتھوں میں آ کے خوش ہیں بہت
ہوا بھی مجھ پہ بہت ناز کرنے والی ہے

جو لوگ جانتے ہیں مجھ کو وہ سمجھتے ہیں
مری خموشی بھی آواز کرنے والی ہے

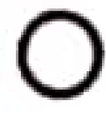
وہ آنکھ چپ ہے ہمیشہ سے پھر بھی لگتا ہے
کہ جیسے اب سخن آغاز کرنے والی ہے

ہوائے شام کہ کرتی تھی اجتناب بہت
سنا ہے اب مجھے ہمراز کرنے والی ہے

جو ایک نہر گزرتی ہے شہر دل سے جمالؔ
کبھی وہ خوش، کبھی ناراض کرنے والی ہے



وفور کیف سے سن ہو گئے تھے ہاتھ مرے
کہ اس کے عارض و لب کا سفر ہی ایسا تھا



اس بزم میں دل پہلو بدلتا ہے تو بدلے
دریا سے کوئی پیاسا نکلتا ہے تو نکلے

پلکیں ہیں کسی خواب کے انبار سے بوجھل
وہ اب بھی اگر بوجھ بدلتا ہے تو بدلے

ہے عشق گر اس سے تو یہ لازم ہے کہ عاشق
جلتا ہے تو جل جائے پگھلتا ہے تو پگھلے

کمروں میں پڑے نیند کے ماتوں کو غرض کیا
شب بھر کوئی آنگن میں ٹہلتا ہے تو ٹہلے

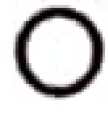
میں ترک کیا رات کو اب گھر سے نکلنا
مہتاب مرے راز اگلتا ہے تو اگلے

کیوں جرم ہے احوال محبت کا سنانا
اچھا ہے اگر کوئی سنبھلتا ہے تو سنبھلے

یہ تیرا رویہ ہے کہ ہم سوچ رہے ہیں
دل تیرے علاوہ بھی بہلتا ہے تو بہلے

اپنائے ہیں میں نے بھی عجب طور طریقے
وہ بھی نئی پوشاک بدلتا ہے تو بدلے





نہ حال پوچھتا ہے اور نہ کام پوچھتا ہے
یہ عشق اپنے مریضوں کا نام پوچھتا ہے

وہ روز ڈھاتا ہے اک گوشہ عمارت دل
اور آپ ہی سبب انہدام پوچھتا ہے

میں یوں بتاتا ہوں تفصیل انتشار اسے
کہ جیسے وہ زرہ انتظام پوچھتا ہے

یہ مکر کرتا ہے پھر بھاؤ تاؤ مجھ سے مرا
وہ پہلے ساری دکانوں سے دام پوچھتا ہے

سفر کا اذن بھی دیتا نہیں کسی صورت
اگر نہ جاؤ تو وجہ قیام پوچھتا ہے

وہ اپنے رنج بھلا کیوں مجھے بتانے لگا
جو میرا حال بمشکل تمام پوچھتا ہے

جواز رکھتا ہوں میں اس گلی میں ہونے کا
کوئی مجھے پس دیوار و بام پوچھتا ہے

شریک ہے وہ کسی دوسرے کی سانسوں میں
مگر یہ دل کہ اسے صبح و شام پوچھتا ہے



○

صرف اس کی رفاقت مجھے کافی بھی نہیں تھی
یہ ایسی کوئی وعدہ خلافی بھی نہیں تھی

کیوں روکتا غیبت سے میں احباب سخن کو
یہ بات طبیعت کے منافی بھی نہیں تھی

صف میں وہ نمایاں نظر آیا مجھے سب سے
گو اس میں کوئی بات اضافی بھی نہیں تھی

لکھتے تھے غزل اس کو سنانے کے لیے جب
یہ فکر مضامین و قوافی بھی نہیں تھی

افشا نہ کیا اس نے کسی راز کو میرے
ہرچند کہ وہ آنکھ غلافی بھی نہیں تھی

○○○

علامتیں بہت سی ہیں نشانیاں بہت سی ہیں
ترے نہ ہونے کی مگر کہانیاں بہت سی ہیں

○

شکوے میں کبھی اور نہ فریاد میں رکھا
اس دل کو فقط ہم نے تری یاد میں رکھا

کیا اپنا بھروسا ہے کہ اس آنکھ نے ہم کو
ہر وقت نئے عالم ایجاد میں رکھا

کیوں دل پہ توجہ کہ چلے جانے سے تیرے
یا رہ گیا اس خانہ برباد میں رکھا

اک خوبی اضافی رکھی تعمیر میں اس نے
اک نقص مرے شہر کی بنیاد میں رکھا

اللہ نے ہنر خوب دیے ہیں مجھے پھر بھی
جو مجھ سے بچا وہ مری اولاد میں رکھا

○○○

شکستگی میں جو گھر خواب سے زیادہ ہے
مجھے ستارہ و مہتاب سے زیادہ ہے

○

صدق چلتا ہے کوئی اور نہ ہنر چلتا ہے
شہر بے حس ہے یہاں کار دگر چلتا ہے

کوئی رک جاتا ہے اور کوئی بشر چلتا ہے
یہ مری جان سر راہگزر چلتا ہے

ناؤ سے پوچھتا ہے کیا ہوا ملاح ترا
ایک دریا کہ پس دیدہ تر چلتا ہے

کون چوپال میں سنتا ہے جو گزرے دل پر
اس جگہ داستاں گوئی کا ہنر چلتا ہے

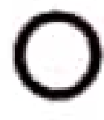
وہ ہر اک کھیل میں کچھ مہرے بدل لیتا ہے
اور پھر چال بہ انداز دگر چلتا ہے

پس دیوار بہت کی تری کردار کشی
سر بازار ترا سکہ مگر چلتا ہے

کام تو کیا کہ ترے نام پہ قدغن ہے یہاں
تذکرہ پھر بھی ترا شام و سحر چلتا ہے

کسی کے نام پہ خیرات چلی آتی ہے
مجھ کو معلوم ہے جس طرح یہ گھر چلتا ہے





خواب کیا تھا مرا، تعبیر مجھے کیا دی ہے
ایک زنجیر سے لپٹی ہوئی آزادی ہے

ایسی آتش سے ہم آغوش ہوا ہوں جس سے
جسم مانوس ہے پر روح کہاں عادی ہے

اس نے کشکول بڑھا کر کوئی سرگوشی کی
میں نے آواز لگائی ترا فریادی ہے

چھوڑ بھی سکتا ہوں اور قتل بھی کر سکتا ہوں
پر اسے بھولنے کا مسئلہ بنیادی ہے

لڑکھڑایا تو صدا دے کے سنبھالا اس نے
دل بھلا اتنی محبت کا کہاں عادی ہے

ہے تری یاد مرے دل کی گزر گاہوں میں
یا کوئی راستہ بھولی ہوئی شہزادی ہے

ہر قدم پر کوئی قدغن ہے قفس سے باہر
قید میں حلقہ زنجیر کی آزادی ہے

اس سے پھر ملنے کا امکان بھی رکھا ہے جمالؔ
خشت بوسیدہ بھی دیوار میں چنوا دی ہے



○

وہ صبحِ وصل کر کے پریشان بھی گیا
لیکن ردائے وعدہ شب تان بھی گیا

اک بار میں سفارشِ اشک و دعا کے بعد
اس انجمن میں بے سرو سامان بھی گیا

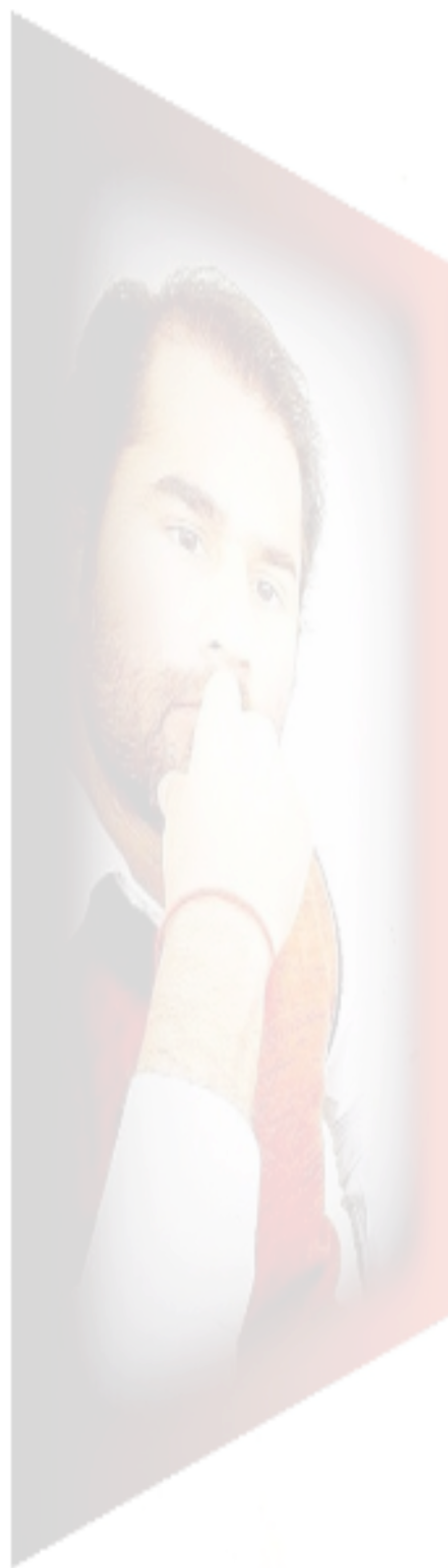
رخصت ہوا ہے دل سے تمہارا خیال بھی
اس گھر سے آج آخری مہمان بھی گیا

ایسا کہاں وہ ماننے والا تھا میری بات
بادل اُمڈ کے آئے ہیں تو مان بھی گیا

بہکا رہا ہے کون مجھے یوں ترے خلاف
اک مرتبہ خود اپنی طرف دھیان بھی گیا

کیا کر سکے گا شہر کہ مرنے سے پیشتر
گر اپنے قاتلوں کو میں پہچان بھی گیا

دشمن کے دل میں اب بھی ہے دہشت مری جمالؔ
ہر چند میرے ہاتھ سے میدان بھی گیا



جمال اپنے سفر کا خود ستارہ

ریاض احمد شاد صاحب سے میری شناسائی کا عرصہ آپ کو ان کی اس تحریر سے معلوم ہو جائے گا۔ اس مضمون کو ان صفحات کی زینت بنانے کا فیصلہ اس لیے کیا گیا کہ یہ مجھ پر واحد مضمون ہے جو غیر مطبوعہ ہے (میرے علم کے مطابق) اس کے غیر مطبوعہ رہنے کی وجہ یہ ہے کہ مضمون نگار نے سرگودھا کی ایک تقریب میں یہ مضمون پڑھ کر میرے حوالے کر دیا تھا کہ کہیں شائع کروا دوں (ان کا خیال تھا کہ مدیران رسائل و اخبارات سے میری ''سلام دعا'' زیادہ ہے۔)

اب تین برس بعد یہ تحریر مکان بدلتے ہوئے سامان کی الٹ پلٹ میں اچانک مجھے مل گئی۔ اس عرصے میں پل کے نیچے سے خاصا پانی گزر چکا ہے' مگر ریاض احمد شاد صاحب کی بے ساختہ محبت مجھ میں ابھی تک تازہ ہے۔ لہٰذا یہ مضمون موصوف کی اجازت کے بغیر اپنی اس کتاب میں شامل کر رہا ہوں۔ فیصلہ چونکہ اچانک کیا گیا ہے۔ اس لیے اجازت طلب کرنے کا نہ تو وقت ہے اور نہ شاد صاحب کا پتہ

..........جمال احسانی

جمال احسانی' جمال اور احسان کا مرکب ہے۔ یہ اس کا نام بھی ہے' اس کی شخصیت بھی اور اس کی شاعری کا بنیادی استعارہ بھی۔ اس کا اصل نام کیا ہے؟ خدا جانے اسے خود بھی یاد ہے یا نہیں۔ اب تو یہ دو لفظی مرکب ہی وہ محور ہے جس کے ارد گرد وہ طواف کرتا رہتا ہے۔ اس کی شاعری میں جتنے بھی لفظ استعمال ہوئے ہیں وہ محض اس کوشش کا نتیجہ ہیں جو اس نے ان لفظوں کی روح میں اترنے کے لیے کی ہے۔ اسی جتن میں اس سے شعر سرزد ہوئے ہیں۔ یہ اس کی لاشعوری حرکت ہے۔ اس کے شعر اس کی جمالی شخصیت کا لازمی حصہ ہیں گویا خالق اور تخلیق ایک ہی جرم میں ایک دوسرے کے ساتھ ملوث ہیں۔ اسلوب کے لحاظ سے جمال احسانی مجھے بوسکی کا تھان لگتا ہے۔ نرم' ملائم اور گداز۔ یہی اس کی شخصیت ہے اور یہی اس کی شاعری۔ اگر کسی نے تازہ گلاب کی ڈھیروں پتیوں پر لیٹنے کی راحت کا مزہ لینا ہو تو وہ جمال احسانی کی شاعری پڑھے پھر وہ کہیں بھی لیٹے یہ راحت خود بخود اس میں رچ بس جائے گی۔

جمال احسانی سے میری پہلی ملاقات اس وقت ہوئی جب وہ کوئی چار پانچ سال پہلے سرگودھا آیا تھا۔ اس وقت وہ ایک دبلا پتلا سا' تابع فرمان قسم کا لڑکا تھا۔ سرگودھا سے اسے والہانہ پیار تھا۔ وہ یہاں کی گلیوں' کوچوں میں تنہا پھرتا ہوا ان راستوں کی سرگوشیاں سنا کرتا' جہاں اس نے اپنا بچپن گزارا تھا۔ مجھے وہ ہائی اسکول کے لڑکوں جیسا امنگوں بھرا اور فرماں بردار سا طالب علم لگتا تھا۔ اس وقت اس نے جو غزلیں سنائیں انہیں سن کر میں کم از کم اس بات کا قائل ہو گیا کہ کراچی میں کچھ ایسے اچھے شاعر بھی ہیں جن کا ابھی ہمیں علم نہیں اور جن کی غزلیں یہ ہمیں سناتا پھرتا ہے۔ خیر! میں نے سوچا' اس عمر میں سب کا مزاج ہی شاعرانہ ہوتا ہے۔ کسی کی ایک آدھ رومانی غزل پر ہاتھ صاف کر لینے میں حرج ہی کیا ہے۔ پھر وہ تو ابھی بچہ ہے لوگ تو بزرگ ہو کر بھی ایسی معصوم حرکتوں سے باز نہیں آتے۔ مجھے یہ بھی قائل ہونا پڑا کہ چلو غزلیں کسی کی ہوں گی' لیکن کم بخت کا ذوق اچھا ہے۔ شعر اچھے چوری کیے ہیں اور پڑھتا بھی ٹھیک ہے۔

چار پانچ سال کے بعد گزشتہ دنوں اسلام آباد میں جمال سے میری دوسری ملاقات ہوئی۔ میں نے اسے جب ذرا دور سے دیکھا تو پہلی نظر میں میرے لیے پہچاننا مشکل ہو گیا۔ کیا یہ وہی جمال احسانی تھا جو پہلے سے چار پانچ گنا زیادہ چربی پہنے ہوئے تھا۔ مجھے خدشہ ہوا کہ چربی کی یہ زیادتی کہیں اس کی آنکھوں تک نہ پہنچ گئی ہو۔ چلو ڈھنگ سے نہیں ملے گا' ہمارا کیا بگاڑ لے گا' ایک سلام کر کے دیکھ لیتے ہیں۔ میں نے اس سے ایک کھردرے سے ادب کی توقع کرتے ہوئے ایک مودبانہ سی فرینک نیس کے ساتھ سلام کیا اور اس نے کوئی جواب دینے کے بجائے مجھے ایک زوردار چھپا مار لیا۔ میں چونکہ ایسی حرکت کے لیے تیار نہیں تھا اس لیے میرے دونوں بازو اس کے چھپے میں جکڑے گئے...... یہ چھپا ایک طرف تو میری لاعلمی میں پڑ گیا اور دوسری طرف یہ بالجبر تھا۔ بہرحال میں اس کی قربانی سے بہت متاثر ہوا۔ قربانی یوں کہ میں نے جب اسے سلام کیا تھا تو وہ ایک خاتون سے محو گفتگو تھا۔ اس نے اس محویت کو فوراً ملتوی کر کے مجھے گلے لگایا تھا۔ اب اللہ جانے یہ اس کا خلوص تھا یا مذکورہ محویت کا نشہ.......

اس سے اس دوسری ملاقات کے بعد احساس ہوا کہ اس میں خلوص اور پیار کا جذبہ اسی طرح برقرار ہے۔ اس کا حجم ذرا پھیل گیا ہے۔ جس سے اس کی شخصیت بظاہر بدل گئی ہے لیکن مل کر اور خاص طور پر گلے مل کر یہی محسوس ہوتا ہے کہ چار' پانچ سال پہلے کا دس بارہ گز بوسکی کا وہ تھان اب چالیس پچاس گز کا ہو گیا ہے' لہٰذا اس سے اس کی نرمی اور گداز میں اضافہ ہی ہوا ہے۔ میں جمال احسانی کی شخصیت کا کوئی بھرپور

تعارف نہیں کرواسکتا۔ ادھوری سی دو ملاقاتوں سے میں نے جو غیر واضح تاثر لیا تھا وہ اس کی شاعری پڑھ کر بہت واضح ہو جاتا ہے۔ ''ستارہ سفر'' میں وہ غزلیں بھی شامل ہیں جو اس نے چار پانچ سال پہلے سنائی تھیں۔ اس کے بعد کی غزلوں میں وہی تیور مزید نکھر کر سامنے آئے ہیں جو پہلی غزلوں کا خاصہ تھے' چنانچہ اس سے یا تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ نرمی' گداز اور خلوص شروع ہی سے اس کی شخصیت کا حصہ ہیں اور یا یہ کہ چار پانچ سال پہلے اس نے جس شاعر کی غزلیں چرائی تھیں اب تک اسی پر ہاتھ صاف کرتا آ رہا ہے۔ بہر حال شاعر کے خلوص کا ریشم اور لہجے کے گلاب اس کتاب کے ہر صفحے پر بکھرے ہوئے ہیں۔ وہ ٹوٹ کر چاہنے والا شخص ہے اور اسی شدت سے چاہے جانے کا طلبگار بھی۔ چاہا اس نے بہت ہے' لیکن چاہا گیا بہت کم ہے۔ اور اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ جب وہ گلے ملتا ہے تو جوش جذبات سے دوسرے کے بازو بھی جکڑ لیتا ہے۔ بہر حال اس کا جذبہ اور اس کی تڑپ دو ایسے پہلو ہیں جن کا اظہار اس کی شاعری میں متعدد جگہوں پر ہوا ہے ۔

محبتوں کی بلندی پہ ہے یقیں تو کوئی
گلے لگائے مری سطح پر اتر کے مجھے

چراغ بن کے جلا جس کے واسطے اک عمر
چلا گیا وہ ہوا کے سپرد کر کے مجھے

ooo

اس تاریک فضا میں میری ساری عمر
دیا جلانے کے امکان میں گزری ہے

کاش میں تجھ پہ ریاضی کے سوالوں کی طرح
خود کو تقسیم کروں کچھ بھی نہ حاصل آئے

جمال احسانی نے وصال کے لمحے بہت گزارے' لیکن جو گزارے ہیں وہ اس کے لیے حاصل

حیات بھی ہیں، سرچشمہ تخلیق بھی۔ اس موضوع پر گو اس کے اشعار بہت کم ہیں، لیکن جو ہیں وہ سرمستی اور سرخوشی کا عجیب والہانہ پن رکھتے ہیں

نہ وہ حسین، نہ میں خوب رو مگر اک ساتھ
ہمیں جو دیکھ لے وہ دیکھتا ہی رہ جائے

مری بیاض سے کاٹے ہیں کس نے شعر جمالؔ
یہ میرے بعد مرے گھر میں کون آیا تھا

جمال کے ہاں ہر جذبہ اپنی پوری شدت کے ساتھ ملتا ہے۔ اس کی شاعری میں جو لینڈ اسکیپ بنتے ہیں ان میں کھلے پانی، وسیع صحرا، لمبا سفر، چلتی ہوائیں اور پھیلا آسمان پینٹ کیے گئے ہیں۔ کھلی کھلی فضائیں لیے ہوئے اس کے شعروں سے شاعر کی خوشی، اس کا ذہن، اس کی امنگیں اور اس کے خواب جھلکتے ہیں۔

سمندروں کا سفر آج تو مزہ دے گا
ہوا بھی تیز ہے کشتی بھی بادبانی ہے

......OOO......

آنکھوں آنکھوں ہریالی کے خواب دکھائی دینے لگے
ہم ایسے کئی جاگنے والے نیند ہوئے صحراؤں کی!

......OOO......

جمالؔ ہر شہر سے ہے وہ شہر پیارا مجھ کو
جہاں سے دیکھا تھا پہلی بار آسمان میں نے

اس کے برعکس اسے بند بند سی فضاؤں، گھٹے گھٹے ماحول اور گھیرتی ہوئی دیواروں سے وحشت ہوتی ہے۔ اس نے اپنے متعدد شعروں میں دیواروں سے اپنی بیزاری کا اظہار کیا ہے۔

دیواروں کا شوق جہاں تھا سب کو جمالؔ
عمر مری اس خاندان میں گزری ہے

ooo

بنی جو صلح کا باعث کسی دن
اسی دیوار کا جھگڑا پڑے گا

اس کی شاعری میں کھلے مناظر سے محبت اور تنگ ماحول سے نفرت بڑے بلیغ استعاروں کے طور پر ابھری ہے۔ اس میں شاعر کی ذاتی واردات سے لے کر ہماری سماجی اور سیاسی زندگی کے سارے رویے سمٹے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ سارے موضوعات ہماری روایتی شاعری کا بھی حصہ ہیں' لیکن فرق یہ ہے کہ جمال احسانی کے ہاں یہ پہلو کسی روایت کا حصہ بن کر نہیں بلکہ شاعر کی ذات کا حصہ بن کر سامنے آتے ہیں۔ ہر اچھی شاعری کی طرح اس کے ہاں سہانے خواب اور مثالی تصورات بھی ملتے ہیں۔ لیکن وہ صرف خواب ہی نہیں دیکھتا ٹھوس حقیقتوں کو بھی کھلی آنکھوں سے دیکھتا ہے۔ ہماری روزمرہ زندگی کے وہ تکلیف دہ پہلو جو آج کے تخلیق کار کا مقدر ہیں' جمال احسانی کی شاعری میں پورے کرب کے ساتھ بیان ہوئے ہیں اور اس کی شاعری کا یہ پہلو مجھے سب سے زیادہ اچھا لگا ہے۔

گھر بھی عزیز' شوق بھی دل میں سفر کا ہے
یہ روگ ایک پل کا نہیں عمر بھر کا ہے

ہونٹوں سے ہونٹ مل گئے دل سے ملا نہ دل
یہ بات بھول جاؤ اگر گھر بسانا ہے

بڑھا کے اس سے رہ و رسم اب یہ سوچتے ہیں
وہی بہت تھا جو رشتہ دعا سلام کا تھا

یہ ہجر کون جانے یہ بات کون سمجھے!!
میں اپنے گھر میں خوش ہوں وہ اپنے گھر میں خوش ہے

تیرا انجام ہوا جو' وہی ہونا تھا جمال
اس جہاں میں تو کسی اور جہاں کا نکلا!

ان شعروں میں جو کرب پنہاں ہے وہ دیکھنے' سمجھنے اور سوچنے والے ذہنوں کا مقدر ہے اور جمال نے اسے کوئی انہونی بات نہیں جانا بلکہ مقدر کا لکھا سمجھ کر حوصلے سے اس کا سامنا کیا ہے۔ وہ حالات کے بارے میں کسی غلط فہمی کا شکار نہیں' لیکن ان تاریک فضاؤں میں دیا جلانے کے امکان کی تلاش اس نے نہ صرف جاری رکھی ہے بلکہ اس نے اپنے ہر شعر میں ایک دیا جلایا ہے۔ اپنے سفر کے ہر قدم پر ایک گونج پیدا کی ہے۔ محبتیں' چاہتیں' روشنیاں' پھول اور خوشبوئیں تقسیم کی ہیں۔ وہ اپنے سفر کا خود ستارہ ہے۔ گویا ستارہ سفر شاعر کی ذات بھی ہے اور اس کی تخلیق کا نام بھی۔ جمال احسانی اور اس کی شاعری پر اگر ایک جامع اور مختصر تبصرہ کرنا ہو تو میرے نزدیک اس کا یہ شعر بڑا مناسب رہے گا۔

ایک فقیر چلا جاتا ہے پکی سڑک پر گاؤں کی
آگے راہ کا سناٹا ہے پیچھے گونج کھڑاؤں کی

ریاض احمد شاد

''۲۵ اکتوبر ۱۹۸۳ء کی شام سرگودھا میں ''ستارۂ سفر'' کی تقریبِ رونمائی میں پڑھا گیا۔''



تارے کو مہتاب کیا



بہت دوسروں کو بہم آیا میں
مگر اپنے حصے میں کم آیا میں



شہناز کے نام

کوئی طوفان ہو رہتا ہے جمالؔ
ایک دریا کا کنارہ مرے ساتھ



ہے اس دنیا کا ماضی میرے آگے
یہ رشوت دے کے بنوائی گئی ہے

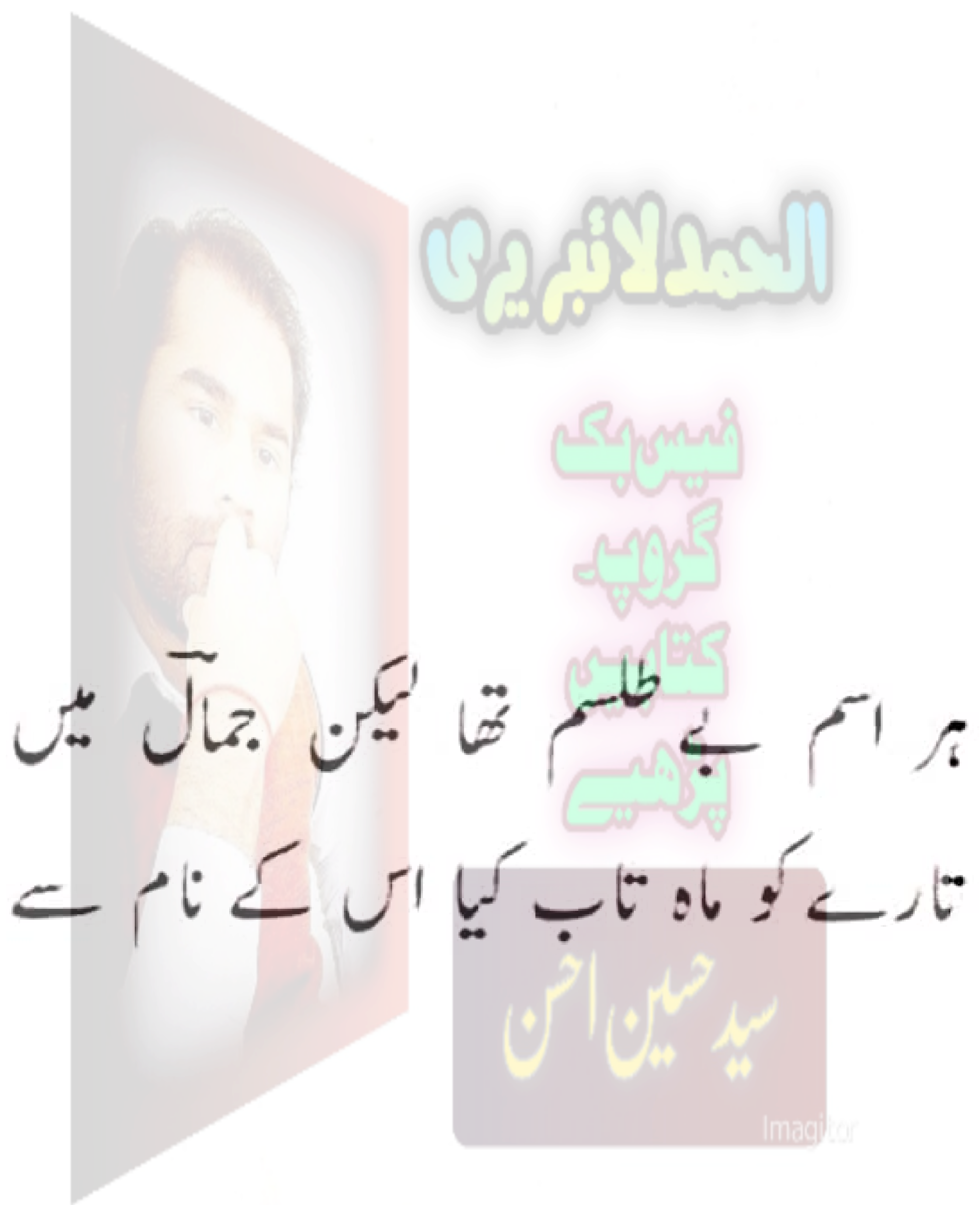
سلسلہ



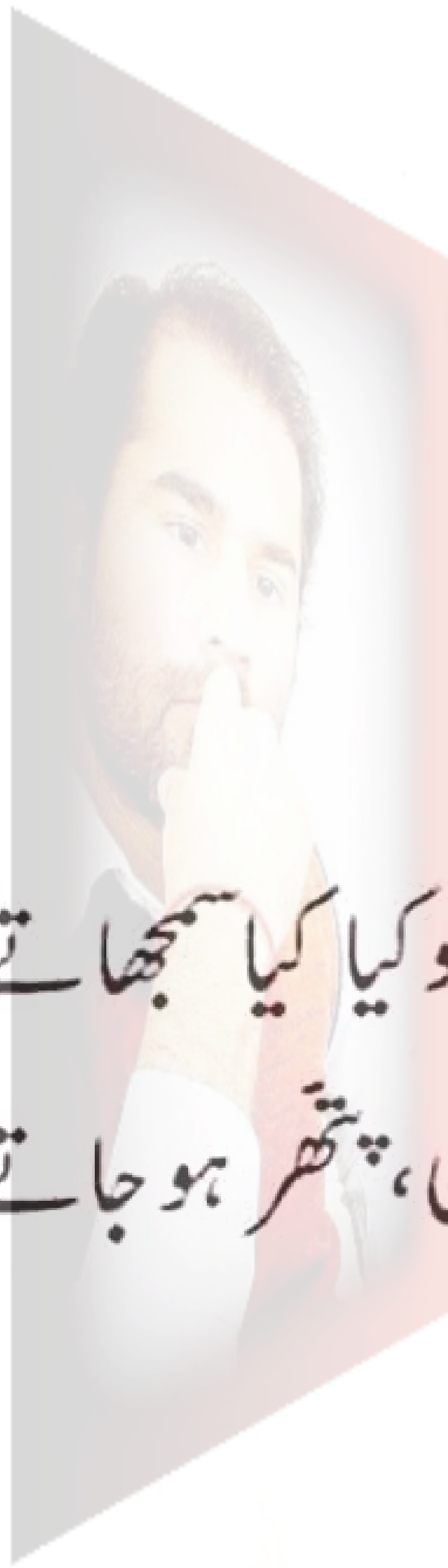





الحمد لائبریری
فیس بک
گروپ۔
کتابیں
پڑھیے
سید حسین احسن
Imagitor



ہر اسم بے طلسم تھا لیکن جمال میں
تارے کو ماہ تاب کیا اس کے نام سے



اس کی نگاہ سے بچ کر خود کو کیا کیا سمجھاتے تھے ہم
لیکن جب وہ آنکھ اُٹھتی تھی، پتھر ہو جاتے تھے ہم

درونِ خانہ

میں جتنا کتنا بھی ہوں' اپنی شاعری کے سبب ہوں اور جو کچھ میں نہیں ہوں' اس کا سبب بھی میری شاعری ہے۔

شاعری دراصل میری جزا بھی ہے اور سزا بھی' یہ میرا انعام بھی ہے اور دشنام بھی۔ میری فتح بھی شاعری کی مرہونِ منت ہے اور میری شکست کے پردے میں بھی میری شاعری ہی کارفرما ہے۔ اس نے مجھے عزت بھی بہت دی اور رسوائی بھی۔ اس کے ذریعے لوگ مجھ سے خوش بھی ہیں اور ناخوش بھی۔ میں نے شاعری ہی سے دنیا برتنے کا فن سیکھا اور میری ساری بے ڈھنگی زندگی' میری شاعری ہی سے وجود میں آئی ہے۔

مجھے شاعری نے اچھے دنوں کے خواب اور برے دنوں کی حقیقتوں سے روشناس کرایا۔ میں نے شاعری ہی سے سب کچھ جانا اور شاعری ہی سے سب کچھ مانا۔ میری تمنائیں' آسودہ اور ناآسودہ خواہشیں' جنوں' خرد' دوستیاں' دشمنیاں' انتہا پسندی' میانہ روی' بے اعتدالی' میری تلون مزاجی' کچھ نہ کچھ کرتے رہنے کی دھن یا ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے کا لطف' یہ سب کچھ مری شاعری کی عطا ہے۔

جہاں شاعری نے مجھ پر ایک نئی دنیا کے مفاہیم اور مطالب کے در وا کیے ہیں وہیں میری دنیوی فہم و فراست پر قدغن بھی لگائی ہے یہی وجہ ہے کہ مصرع موزوں کرنے کے سوا جو کام بھی کیا' اس میں منہ کی کھائی بلکہ بعض اوقات تو مصرع موزوں کرنے کا بھی یہی نتیجہ سامنے آیا۔ ایسے لمحات بھی گزرے کہ شاعری سے ہاتھ کھینچنے کا ارادہ کیا مگر دوسرے سب ارادوں کی طرح یہ بھی شرمندۂ تعبیر نہ ہوا لہٰذا عام آدمی کی طرح جینے کو جی چاہتا ہے نہ خاص آدمی کی خو بو مزاج کا حصہ ہے۔ بہرحال یہ راستہ میرا خود اختیار کردہ ہے اس لیے مجھے اس کے سکھ بھی عزیز ہیں اور دکھ بھی۔

میں نے اپنی ماں کو واحد سکھ یہ دیا کہ میں ان کی زندگی میں نہیں مرا۔ وہ اس لئے مر گئیں کہ ان سے اپنے کمزور بچے کی حالت دیکھی نہ گئی۔ ابا نے یہ بھی نہ کیا' انہوں نے محض ایک کروٹ لی اور مر گئے۔ اتنی

رائیگاں موت کسی کسی ہی کو میسر آتی ہے۔ بڑے بھائی گاڑی کھینچتے کھینچتے عمر میں ابا سے بڑے ہو گئے ہیں۔ ان کے اپنے محدودات ہیں' اپنا پریوار ہے' صبح ہوتے ہی کام پر نکل کے رات گئے لوٹتے ہیں۔ بہت کچھ کرنا چاہتے ہیں مگر کس کی مجال کہ استطاعت سے تجاوز کرے۔ ایسے پراگندہ لوگ خال خال ہی نظر آتے ہیں۔

دو چھوٹے بھائی ہیں۔ دونوں فرماں بردار' دونوں نوٹ کر چاہنے والے۔ جانے انہیں دنیا کمانی کیسے آئی؟ تین بہنیں ہیں' تینوں اپنے شوہر اور بچوں میں اشتم پشتم' بیمار پڑ جاؤں تو رو رو کر آسمان سر پر اٹھا لیتی ہیں۔ صحت یاب ہو جاؤں تو میری طرف رخ نہیں کرتیں۔ سب کی سب مجھ پر جان دیتی ہیں۔ بڑی والی بہن اپنا پورا کنبہ لیے بیٹھی ہیں۔ کیا سسرال کیا' کیا میکا' سب کے دکھ درد میں شریک' منجھلی والی چھوٹی چھوٹی خواہشات اور ہمہ وقت منصوبہ سازی میں مصروف۔ چھوٹی والی نسیمہ کا بس نہیں چلتا کہ میرے لیے کلیجہ نکال کر رکھ دے۔ میں مطمئن تو وہ خوش' میں اداس تو وہ رنجیدہ۔ اس کا بس چلے تو وہ شاید میری موت سے بھی نبرد آزما ہو جائے۔ کاش اس کا انتقال مجھ سے پہلے ہو۔

چار بچے ہیں' تین بیٹے اور ایک بیٹی۔ عملی زندگی میں آئیں تو پتا چلے کہ کون کتنے پانی میں ہے؟ دراصل ہماری معاشرتی بنت ایسی ہے کہ اولاد کے بارے میں' کوئی بھی پیش گوئی غلط ثابت ہونے کا احتمال ہے۔ لہٰذا اس بارے میں نہ تو ناخوش فہم ہوں اور نہ خوش فہم' جو ہونا ہے' ہو کر رہے گا' جو نہیں ہونا ہے' اسے کوئی کچھ کر نہیں سکتا۔

اب میں اپنے جس قریبی اور آخری رشتے کا ذکر کرنا چاہتا ہوں' وہ شاعری میں ہمیشہ تضحیک' تنقیص اور مذاق کا نشانہ بنا رہا۔ یعنی شاعر کی بیوی۔ شہناز سے میری شادی کو چوبیس سال ہو رہے ہیں۔ اس وقت کی یہ معمولی اور عام سی لڑکی' میری بڑی بھاوج کی پسند اور معیار تھی۔ مجھے ایک کھونٹ سے باندھنا مقصود تھا سو باندھ دیا گیا۔ شروع شروع میں رسی تڑانے کی ایک آدھ کوشش بھی کی مگر شہناز نے ڈور اتنی ڈھیلی رکھی کہ شام ڈھلے قدم از خود گھر کی طرف اٹھ جاتے۔ دو دو چار چار روز تک اپنے گھر کا دروازہ نہ دیکھنے کا عادی جب ہر صبح اپنے بستر اور کمرے سے نمودار ہوتا تو عجیب وحشت ہوتی۔

پورا سال بھی نہ ہوا ہوگا کہ گھر میں علی میاں یوں آئے ''جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آ جائے'' بہار اور اس کے ثمر اپنی جگہ مگر زندگی کے حقائق کا سامنا بھی تو ضروری ہے۔ میری مالی بدحالی دیکھتے ہوئے' بڑے بھائی نے پکڑ دھکڑ کر مشرق اوسط کے ایک نگر بھجوا دیا۔ زندگی کون سی ایسی مرتب تھی کہ بہتر نتائج برآمد ہوتے۔ برے حال بانکے دہاڑے گیا تھا' ایک سال بعد جوں کا توں لوٹا تو آذر میاں پانچ مہینے کے تھے۔

زندگی ایک بار پھر زیرو پوائنٹ سے شروع ہوگئی۔ اللہ کے فضل کے آج بھی وہیں کھڑا ہوں۔ حرا اور ثبات بھی زندگی کا حصہ بن چکے ہیں۔ حالات کی بھٹی میں احساس راکھ بھی ہونے لگے تو ایک ہاتھ شانہ تھپتھپانے لگتا ہے اور وہ ہاتھ شہناز کا ہوتا ہے جس کی لکیروں میں اب تو گرد ماہ و سال مستقل ڈیرا ڈالے بیٹھی ہے۔ لڑکی اپنے الھڑ پن کے رنگ اور روپ سے بچھڑ کر ایک پختہ کار عورت بن چکی ہے۔

اپنے بابل کی طرف پلٹ کر نہ دیکھنے والی شہناز شب و روز مجھ میں اور میرے بچوں میں خرچ ہوتی رہتی ہیں۔ شہناز نہ ہوتیں تو میں بھی اپنے خاندان سے کوسوں دور ہوتا۔ وہ مجھے میرے لوگوں سے جوڑے رکھتی ہیں۔ آنچ مجھ پر آئے برا بھلا انہیں سننا پڑتا ہے۔ بیمار میں پڑوں میرے بہن بھائی ذمے دار انہیں گردانتے ہیں۔ اپنے بھائی کے سب کرتوتوں سے اس کی بیوی کا دامن بھرنا ہمارے معاشرے کا کتنا سہل اور محبوب مشغلہ ہے۔ میرے حالات کا شکار ہونے والی شہناز اس چکی میں بھی مسلسل پس رہی ہیں۔ میرے چاہنے والوں کو کیا غرض کہ ان کی یک طرفہ محبت کے باعث مجھے شہناز کے ساتھ ایک ندامت بھری زندگی گزارنی پڑ رہی ہے۔ قصہ مختصر شہناز نے خود کو مجھ میں کھپا دیا مجھ سے میرے سوا کبھی کچھ طلب نہ کیا۔ مجھے ہمیشہ میرے حق سے بڑھ کر نوازا۔ ایک میں کہ گزشتہ چوبیس برسوں میں شہناز کے ساتھ ہونے والی حق تلفیوں کا ازالہ تو کیا ان پر سوچنے اور شرمندہ ہونے کے لیے وقت بھی نہ نکال سکا۔ واہ رے اے مشرقی شوہر!

ایک بار عالم سرمستی میں گھر لوٹا تو دیکھا کہ شہناز اور میرا منجھلا بیٹا آذر گنگا جمنا بہا رہے ہیں۔ ان دونوں کا ایک ساتھ گریہ کرنا میرے لیے نئی بات تھی۔ بہت پوچھنے کے بعد معلوم ہوا کہ آذر زندگی میں پہلی بار کچھ روپے کما کر لایا جنہیں شہناز نے یہ کہہ کر لینے سے انکار کر دیا کہ بیٹے یہ رقم ابو کو دینا۔ خدا انہیں سلامت رکھے میری ہر ضرورت انہی کے ہاتھ سے پوری ہو تو سکون ملتا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ اتنی گہرائی تک سوچنے کی دانش شہناز میں کہاں سے آئی۔ شادی کے بعد میٹرک اور انٹر کرنے والی شہناز کا اردو اور انگریزی تلفظ آج بھی ایسا ہے کہ ہمارا سب سے چھوٹا بیٹا ثبات ان کا مذاق اڑاتا ہے اور شہناز اپنی غلطی کے اعتراف میں محض مسکرا دیتی ہیں۔ حقیقت ہے کہ مجھ میں زندہ رہنے کی تمنا محض ان کی زندگی سے مربوط ہو کر رہ گئی ہے۔ مرنے سے محض اس لیے گھبراتا ہوں کہ میرے بعد وہ اپنی باقی ساری زندگی مرنے ہی میں گزار دیں گی۔ کاش یہ غلط فہمی ہو۔ رہ گیا گھریلو زندگی کے شب و روز کا قصہ میں اس معاملے میں بالکل نکما ہوں۔ بات یہ ہے کہ سارا دن جاگنے اور پوری رات سونے والے چہروں کے درمیان میرے

معمولات پر جتنی بھی تنقید کی جائے' وہ کم ہے۔ بیوی صبح و شام' شکایات کی عادی نہیں۔ مجھ سے گلہ ہو تو آنکھوں اور چہرے پر ایسے غیر محسوس رنگ اور اتار چڑھاؤ گزر جاتے ہیں' جنہیں صرف میں ہی پہچانتا ہوں۔ زبان تک آنے والا شکوہ یہ ہوتا ہے "آپ فلاں فلاں کو دیکھئے' کیسا وقت کا پابند' گھر سے دفتر اور دفتر سے گھر" پھر کچھ ہی دیر بعد' زیر لب بڑبڑاتی ہیں۔ "مگر ان کا آپ سے کیا مقابلہ؟" میں نے جواب میں کوئی اچھی سی بات کی تو وہ ایسی بن گئیں گویا کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ ان کے مزاج کی نرمی میرے غصے کی تیزی کے لیے ہمیشہ تریاق نکلی۔ اکثر سوچتا ہوں کہ اگر میری زندگی میں شہناز نہ ہوتیں تو میرا عالم محرومی' قابل رحم ہوتا۔

ممکن ہے' میرے اکثر قارئین یہ سمجھیں کہ میں یہ سب کچھ بیوی کی خوشنودی کے لیے لکھ رہا ہوں۔ انہیں معلوم ہو کہ یہ خوشنودی مجھے بغیر کسی تعریف و توصیف کے میسر ہے۔ میرے قریبی لوگ جانتے ہیں کہ شہناز کے سلسلے میں یہ میرا پہلا اعتراف ہے۔

اب ذرا کچھ باتیں اپنے خاندان کے بارے میں جس کا ذکر میرے جیسا پس منظر رکھنے والے کرنے سے کتراتے ہیں اور ایسے تذکرے عیبوں کی طرح چھپاتے ہیں۔ میرے خانوادے میں نہ وہ جو بہ قید حیات ہیں اور نہ ہی ان سے پہلے کسی ایسے شخص کا سراغ ملتا ہے' جو شاعری کرتا ہو یا ادب و شعر سے جس کی رغبت' واجبی سے کچھ زیادہ ہو۔ ایسے ماحول میں پروان چڑھنے والے ایک شاعر کا الفاظ کی مختلف تہوں اور جہتوں سے تعلق پر مسلسل اصرار کرنا اور ان میں اپنے برے بھلے لمحات بسر کرنا باعث حیرت ہے۔ اس پر مستزاد شعر لکھنا جو ایسا جان جوکھوں کا کام ہے کہ اگر میرے بس میں ہوتا تو کبھی کا ترک کر دیتا۔ جبکہ حال یہ ہے کہ "ستارہ سفر" اور "رات کے جاگے ہوئے" کے بعد یہ میرا تیسرا شعری مجموعہ "تارے کو مہتاب کیا" بھی آپ تک پہنچ گیا ہے۔ خدا مجھ پر رحم کرے اور آپ پر بھی۔

میرے آبا و اجداد میں دو تین کے سوا کوئی ایسا بھی نہیں' جس کا ذکر کسی تاریخی متن میں تو کیا' کسی حاشیے ہی میں آ گیا ہو۔ نمایاں شخصیات میں' تین چار اولیا اکرام' پانچ سات قرآن پاک کے حفاظ' آٹھ دس کلام پاک کے خوش الحان قاری اور کچھ موذن و امام کہ پانی پت میں یہ طریق عام تھا۔ اس کے علاوہ میرے بزرگوں میں چند ایک انگریزوں کے بستہ بردار' فوج کے دو ملازم' ریلوے کے چار نوکر' تین پٹواری' پانچ پولیسیے' پیشہ ور مقدمات کے کئی ایک رسیا' تین حکما' مجرے کے دو شوقین اور بہت سے نرے نااہل' نکھٹو اور ہڈ حرام۔

میرے دو چار عم زاد اور رشتے کے کچھ گھرانے، شاعری سے میری وابستگی پر خوش ہیں اور فخریہ اس کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ بہت سے میرے تند و تیز فقروں اور سخت قسم کے جوابات سے شدید نالاں۔ اکثر میری بذلہ سنجی، لطیفہ گوئی اور رفاقت پر نازاں و فرحاں۔ کسی زمانے میں چھیل چھبیلا ہوا کرتا تھا، اب جسم پر چربی کی اتنی پرتیں چڑھ گئی ہیں کہ وہ چھریرے بدن والا نوجوان، ادھیڑ عمری کی سرحد تک آتے آتے، گھر اور شفاخانوں کے راستے کی دھول بن چکا ہے۔ پچھلے ایک برس سے تو مختلف بیماریاں حرزِ جاں بن کر رہ گئی ہیں۔ بہت سے غموں کے ساتھ، اقتصادی اداسی نے بھی زندگی میں ایک راہ بنالی ہے اور اس کے خلاف جنگ ایک معمول بن چکی ہے۔

میں نے شاعری نہ تو شاعری پڑھ کر کی اور نہ سن کے۔ یہ دولت تو کم بخت مجھے بے مانگے ہی ملی۔ یہ خزانہ مجھے کسی نقشے سے نہیں بلکہ لغزشِ پا سے ملا ہے۔ مجھے اپنے بہت سے اشعار کی شہرت اور مقبولیت کا سبب آج تک معلوم نہیں ہو سکا بلکہ بہت سے شعروں کے ہونے کی واردات سے بھی قطعی طور پر نابلد ہوں۔ کچھ شعر تو ایسے ہیں، جنہیں پڑھنے والوں اور سننے والوں کی بے حد پسندیدگی حاصل ہے مگر مجھ پر آن پڑے تو ان کے معانی بھی بیان نہیں کر سکتا کہ میں اس معاملے میں بالکل کورا ہوں۔

۱۹۴۷ء کے اواخر میں والدین بھارت کے ایک قصبے پانی پت سے ہجرت کر کے سرگودھا آ بسے جہاں پہلے ہی سے ان کے دو بڑے بھائی اور دوسرے نزدیک کے عزیز و اقربا، پانی پت سے آ کر جم چکے تھے۔ میں ۲۱ اپریل ۱۹۵۱ء کو سرگودھا ہی میں پی[illegible] سے مارے باندھے میٹرک کیا۔ ایک مکان کا نصف حصہ ابا نے بعد از طویل صبر آزما مقدمے بازی حاصل کیا جسے ان کے انتقال کے بعد فوری اور راشد ضرورت کے ہاتھوں مجبور ہو کر بیچنا پڑا۔ ہم لوگ اسی دوران میں شدید کس مپرسی کے عالم میں کراچی آ کر آباد ہو گئے جہاں ہمارے سامنے ایک نئی دنیا تھی، ایک نئی صبح اور محنت و مشقت کا ایک نیا اور نسبتاً آسان راستہ۔

جب سے ہوش سنبھالا، کسی ذاتی ٹھکانے میں نہ رہا۔ عمرِ عزیز کا اکثر و بیشتر حصہ کرائے کے مکانوں میں گزرا۔ لہٰذا مختلف مکانات کے مالکان کے بے جا ناز بھی اٹھانے پڑے۔ شاید ہی کوئی محلہ ایسا بچا ہو جہاں گزران نہیں ہوئی۔ کبھی مالک کو اپنے مکان کی ضرورت پڑی اور کبھی خود کوئی دوسرا سائبان خوش آ گیا۔ پورے کراچی میں فیڈرل کیپٹل ایریا سے ڈیفنس کے علاقے تک گھر کا سامان ڈھوتے ڈھوتے، اب تو بچے بھی اکتانے لگے ہیں کہ میں ان بے چاروں کو ایک جگہ ٹک کر رہنے کا گھونسلا بھی فراہم نہ کر سکا۔ دو چار مہینے پہلے کلفٹن کے ساحل پر ایک فلیٹ، کرائے پر حاصل کیا، جہاں قریباً چار برس کی طویل مدت تک

بسیرا کیا۔ فلیٹ کی بالکنی سے سمندر اور اس کے کنارے، موجوں سے خوش فعلیاں کرتے ہوئے لوگ، دل اور آنکھوں کو بھلے لگتے۔ میں بالکنی سے اکثر یہ منظر دیکھتا اور بچوں کی طرح خوش ہوتا۔ ذرا حالات بگڑے تو ڈیفنس میں واقع اپنے آفس کے فلیٹ میں، بیوی بچوں کے ساتھ آ بسا۔ جگہ یہ بھی کرائے کی تھی۔

یہ خانہ بدوشی کا ایسا اقدام تھا جس نے سب کچھ تلپٹ کر دیا۔ نہ آفس میں گھر رہ سکا نہ گھر میں آفس، کسی دوسرے کرائے کے نشیمن کی گنجائش نہ تھی۔ کرایوں کے دفتروں اور مکانوں نے آسمان سے ہم کلامی شروع کر دی۔ زندگی ایک خانہ بدوش کی مکمل تصویر بن کر رہ گئی۔ آج ادھر تو کل ادھر، آج یہاں تو کل وہاں۔ آج ڈپازٹ دینا ہے، کل ایڈوانس اور پرسوں ماہانہ کرایہ۔ زندگی اس خانہ بدوش کی مثال بن گئی ہے جو سامان سر پر اٹھائے اٹھائے پھرتا ہے۔ خانہ بدوش اور مجھ میں بس یہ فرق ہے کہ اس پر مہینے کی پہلی تاریخ نہیں آتی جبکہ مجھے ہر مہینے یہ انتظام بھی کرنا ہوتا ہے۔

زندگی کی ایسی بے شمار سفاک حقیقتوں کا سامنا کرنے کے باوجود، میں زندگی بسری کا کوئی باضابطہ اصول نہ بنا سکا۔ جانے مجھے اصول بنانے سے وحشت کیوں ہوتی ہے۔ مجھے بااصول لوگ شاید ہی کبھی اچھے لگے ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ اصول اپنے آپ کو قید کرنے کے لیے بنائے جاتے ہیں۔ اصول پر کاربند رہنے والا شخص اپنی ذات پر بہت سے دریچے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند کر لیتا ہے۔ حالات کی دگرگونی کے باوجود مجھے کھلے آسمان تلے اور تازہ ہوا میں سانس لینا اچھا لگتا ہے۔ میں نے شاعری اور زندگی کا بھی کوئی اصول نہیں بنایا۔ الغرض میں جو کچھ بھی ہوں اور جیسا بھی، اپنے آپ سے نامطمئن ہوں۔ اسی نااطمینانی کا ماحصل، میری زندگی اور شاعری ہے۔

جمال احسانی

دسمبر ۱۹۹۷ء کی چھبیس ویں سرد صبح

(شوکت زیدی اور فاطمہ حسن کی محبتوں سے رچا بسا، ان کا گھر)

○

نشے کی لہر طاری ہو رہی ہے
مری آواز بھاری ہو رہی ہے

رقیبوں پر عنایت بر سرِ بزم
بہت خاطر ہماری ہو رہی ہے

سبھی میرے مرض کو کوستے ہیں
یہ کیا تیمارداری ہو رہی ہے؟

چمن کا راستہ مت گھیر کے بیٹھ
خفا بادِ بہاری ہو رہی ہے

سب اپنے اپنے گھر میں مطمئن ہیں
مجھے کیوں بے قراری ہو رہی ہے

گلی کے ایک گھر میں، عید کے روز
یہ کیسی آہ و زاری ہو رہی ہے

سنا ہے اس گلی سے، عاشقوں کی
نئی فہرست جاری ہو رہی ہے

جو آئے پوچھتا ہے عمر میری
عجب تیمارداری ہو رہی ہے

کہاں جائیں پرانے لوگ تیرے
نئی عاشق شماری ہو رہی ہے

مرے پہلو میں وہ ہے اور مجھ پر
عجب وحشت سی طاری ہو رہی ہے

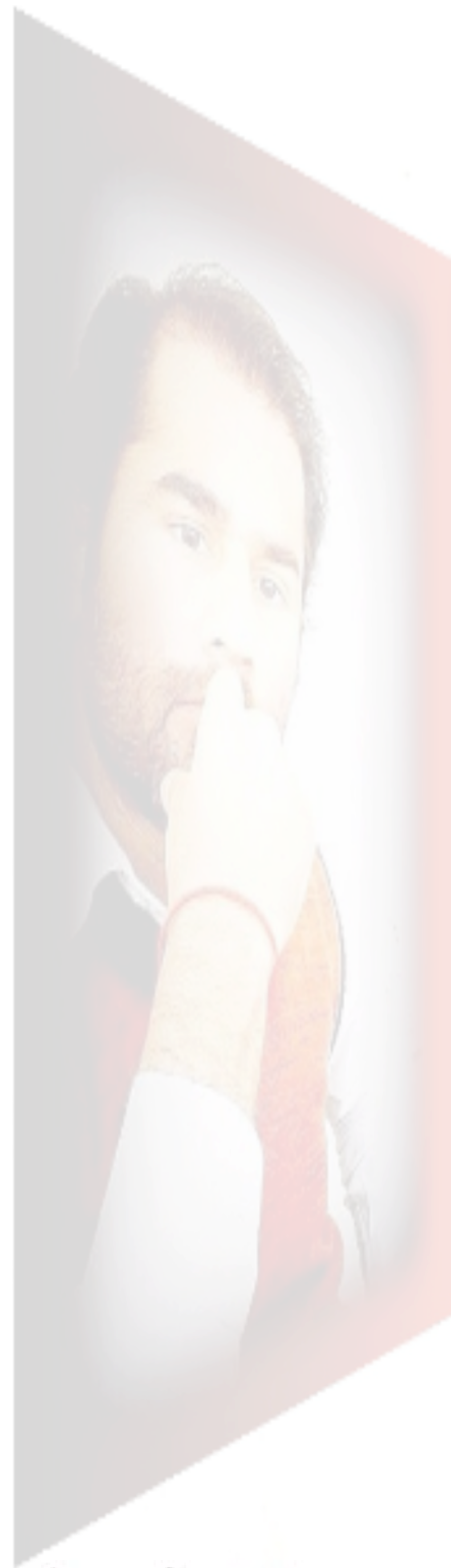
OOO



اک قرض ہے اتار رہے ہیں کسی طرح
اس عمر کو گزار رہے ہیں کسی طرح

خالی دریچہ دیکھ کے لکنت زباں میں ہے
لیکن تجھے پکار رہے ہیں کسی طرح

دنیا کو بھی کسی طرح نزدیک کر لیا
اور نفس کو بھی مار رہے ہیں کسی طرح



تمام اسباب خاک و آب کو اب ڈھونڈنے والا ہے
ترا مہمان، چند لمحوں میں رخصت ہونے والا ہے

یہاں حیثیت انساں اگر کچھ ہے تو اتنی ہے
ابھی یہ سو کر اٹھا ہے، ابھی پھر سونے والا ہے



یہ شہر اپنے حریفوں سے ہارا تھوڑی ہے
یہ بات سب پہ مگر آشکارا تھوڑی ہے

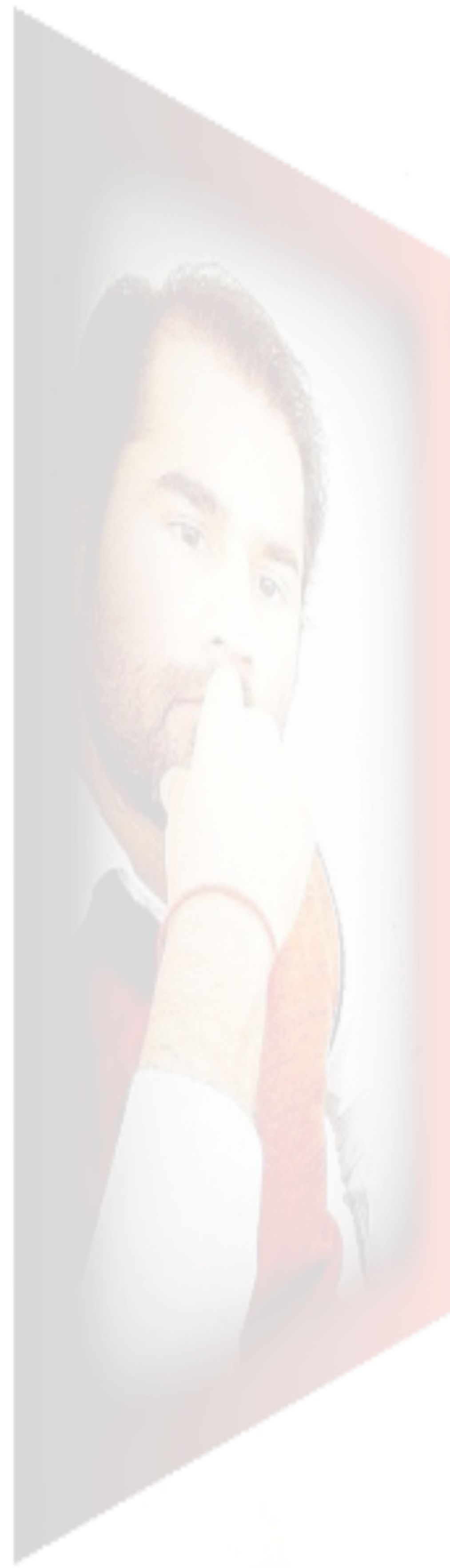
ترا فراق تو رزق حلال ہے مجھ کو
یہ پھل پرائے شجر سے اتارا تھوڑی ہے

جو عشق کرتا ہے چلتی ہوا سے لڑتا ہے
یہ جھگڑا صرف ہمارا تمہارا تھوڑی ہے

درنگاہ پہ اس کے جو ہم نے عمر گنوائی
یہ فائدہ ہے مری جاں خسارہ تھوڑی ہے

یہ لوگ تجھ سے ہمیں دور کر رہے ہیں مگر
ترے بغیر ہمارا گزارا تھوڑی ہے

جمال آج تو جانے کی مت کرو جلدی
کہ پھر نصیب یہ صحبت دوبارہ تھوڑی ہے



جوئے لبریز موڑنی نہ پڑے
اس قدر پی کہ چھوڑنی نہ پڑے

○

ہر ستارے کا مقدر ٹوٹنا تھا
آسماں بچوں کی طرح رو رہا تھا

اتنی مہنگائی تھی بستی میں کہ ہر شخص
اپنے آگے ہاتھ پھیلائے کھڑا تھا

ایسی بولی لگ رہی تھی بادشہ کی
مجھ سے وہ منظر نہ دیکھا جا رہا تھا

تشنہ گان عشق مل کر رو رہے تھے
ایک دریا سستے داموں بک رہا تھا

ایک گھر میں چار آنکھیں جل رہی تھیں
شہر سارا نیند میں ڈوبا ہوا تھا

اتنا عادی ہو گیا تھا میں مرض سے
دل، دوا کے نام سے ڈرنے لگا تھا

سب کو اپنی اپنی پڑنے لگ گئی تھی
درمیاں اک شخص ایسا آ گیا تھا

سیر کی خاطر وہ نکلا اور اس نے
اپنی جیبوں میں گلستان بھر لیا تھا

یہ خبر، اخبار میں کیوں کر نہ آئی
اک شجر کا حسن چوری ہو گیا تھا

مدتوں بعد آج اسے دیکھا تھا میں نے
بال کاڑھے اور منہ دھویا ہوا تھا

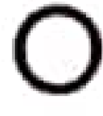
برف کے دیوار و در تھے، اس لیے گھر
گرمیوں کی چھٹیوں میں بہہ گیا تھا

جانے وہ درویش کیسا تھا کہ جو کل
مجھ سے خوابوں کا تقاضا کر رہا تھا

گھر پہنچ کر آنکھ شرمندہ ہوئی تھی
سارا منظر راستے میں گر گیا تھا

کل اسے دیکھا تھا' اک مسجد میں جاتے
میں اسے اچھے دنوں سے جانتا تھا





کل رات میں شکست ستم گر سے خوش ہوا
وہ رو پڑا تو دل مرا اندر سے خوش ہوا

دریا تھا، چاند رات تھی اور اس کا ساتھ بھی
لیکن میں ایک اور ہی منظر سے خوش ہوا

خوش وہ ہے جس کے واسطے دنیا سراب ہے
اس کی خوشی بھی کیا جو میسر سے خوش ہوا

اس آسماں کے نیچے نہیں ایسی کوئی بات
جو خوش ہوا وہ اپنے مقدر سے خوش ہوا

رک سا گیا تھا آنکھ کی خشکی کے درمیاں
چھلکا تو میں بھی اپنے سمندر سے خوش ہوا

جب بھی ہجوم عشق نورداں میں آیا وہ
دو چار سے خفا ہوا، اکثر سے خوش ہوا

میں اس کے ہم سفر سے ملا اس تپاک سے
اندر سے جل کے رہ گیا، باہر سے خوش ہوا

غم بانٹنا تو رسم جہاں ہے مگر جمالؔ
وہ خوش ہوا تو میں بھی برابر سے خوش ہوا



○

یہی نہیں کہ مرے نام سے نہیں نکلا
کوئی ستارہ کسی بام سے نہیں نکلا

مرے لیے بہت آسان تھا رہا ہونا
مگر میں پھر بھی ترے دام سے نہیں نکلا

اشارہ ہے ترے دیدار کی منادی کا
فلک پہ چاند کسی کام سے نہیں نکلا

جو دکھ ملا اسے سکھ میں بدلتے عمر لگی
جو کانٹا چبھ گیا' آرام سے نہیں نکلا

وہ اچھلا برف کے ٹکڑے کی طرح صرف اک بار
پھر اس کے بعد مرے جام سے نہیں نکلا

ooo

خموش ہوں تو مجھے رہنے دے خموش یہاں
گلہ نہ کر کہ وضاحت سے بات بڑھتی ہے

○

کوئی شے مکمل نہیں ہے یہاں
جو ہے وہ مسلسل نہیں ہے یہاں

یہ کس شہر میں آ کے ہم بس گئے
کوئی شخص پاگل نہیں ہے یہاں

عجب بات ہے کہ کوئی آدمی
کسی سے بھی افضل نہیں ہے یہاں

یہی بات لگتی ہے اچھی مجھے
کسی بات کا حل نہیں ہے یہاں

مرا اپنا کوئی سمندر نہیں
مرا اپنا بادل نہیں ہے یہاں

میرا اپنا پرچم نہیں ہے کوئی
مری اپنی مشکل نہیں ہے یہاں

مرے باغ تو خواب کی بات ہیں
مرا اپنا جنگل نہیں ہے یہاں

پھر اس کارخانے کا کیا کیجیے
کہ جو آج ہے کل نہیں ہے یہاں



○

وہ مثلِ آئینہ دیوار پر رکھا ہوا تھا
جو اک انعام میری ہار پر رکھا ہوا تھا

میں بائیں ہاتھ سے دشمن کے حملے روکتا تھا
کہ دایاں ہاتھ تو دستار پر رکھا ہوا تھا

وہ ہی تو ایک صحرا آشنا تھا قافلے میں
وہ جس نے آبلے کو خار پر رکھا ہوا تھا

وصال و ہجر کے پھل، دوسروں کو اس نے بخشے
مجھے تو رونے کی بیگار پر رکھا ہوا تھا

مسلم تھی سخاوت جس کی دنیا بھر میں اس نے
مجھے تنخواہ بے دینار پر رکھا ہوا تھا

خط تقدیر کے سفاک و افسردہ سرے پر
مرا آنسو بھی دست یار پر رکھا ہوا تھا

فلک نے اس کو پالا تھا بڑے ناز و نعم سے
ستارہ جو ترے رخسار پر رکھا ہوا تھا

وہی تو زندہ بچ کے آئے ہیں تیری گلی سے
جنہوں نے سر تری تلوار پر رکھا ہوا تھا

وہ صبح و شام مٹی کے قصیدے بھی سناتا
اور اس نے ہاتھ بھی غدار پر رکھا ہوا تھا

ترے رستے میں میری دونوں آنکھیں تھیں فروزاں
دیا تو بس ترے اصرار پر رکھا ہوا تھا

○

بولنے کی الگ حقیقت ہے
ورنہ چپ رہنا بھی وضاحت ہے

کیا بتاؤں تجھے جدائی تری
میری کتنی بڑی ضرورت ہے

کس کو میں رازداں کروں کہ مجھے
نیند میں بولنے کی عادت ہے

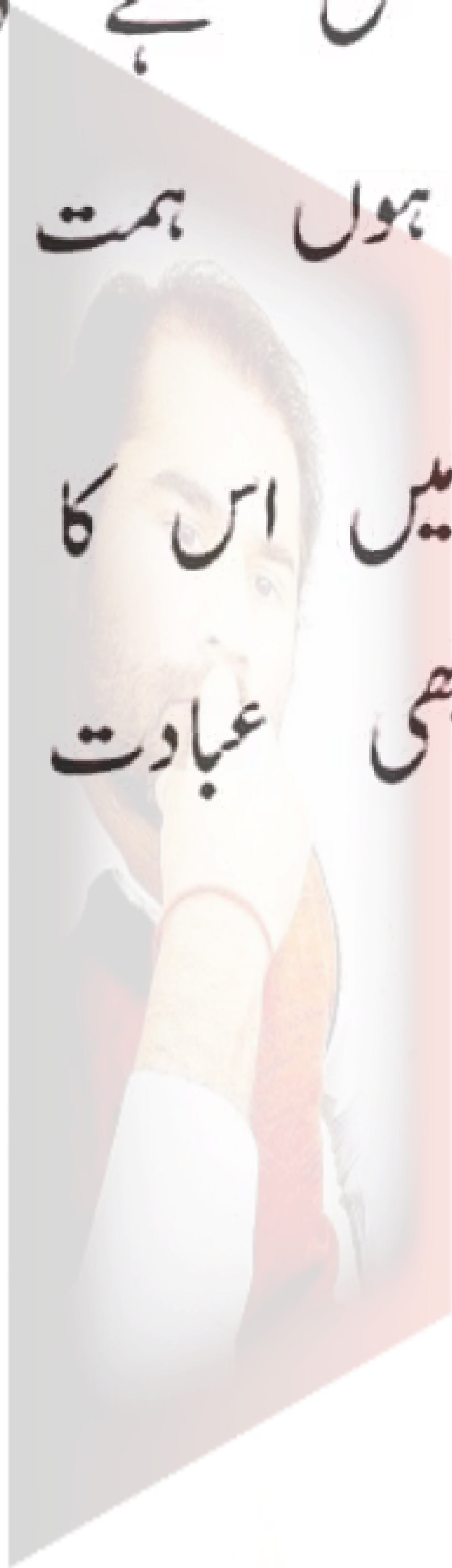
یوں سمجھ لو کہ بے گھری کو مری
در و دیوار کی سہولت ہے

آج کل عشق کرنے والوں کو
کاروبار جہاں کی فرصت ہے

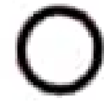
جو بھی ہے نام پوچھتا ہے ترا
یہ بھلا کون سی شرافت ہے

سانس لینے پہ اختیار نہیں
یہ محبت ہے یا مصیبت ہے

ایک بے ہجر عشق ہے درپیش
اور میں جھیلتا ہوں ہمت ہے



ماننے والا ہوں میں اس کا جمال
جس کا انکار بھی عبادت ہے



جہاں بدلنے کا وہ بھی گمان رکھتے ہیں
جو گھر کے نقشے میں پہلے دکان رکھتے ہیں

خدا کے نام کی تکریم کے علمبردار
خدا کے گھر سے بھی اونچے مکان رکھتے ہیں

ہم اپنے جسم میں رکھتے ہیں اک زمیں کی مہک
ہم اپنی روح میں اک آسمان رکھتے ہیں

مرے خدا نے وہ دشمن مجھے نصیب کیے
جو اپنے تیر سے چھوٹی کمان رکھتے ہیں

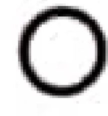
کس کی نیم نگاہی سے جلنے لگتا ہے
وہ جس چراغ میں ہم اپنی جان رکھتے ہیں

عبث ہے ان سے توقع کوئی زمانے میں
جو لوگ نشے میں بھی اپنا دھیان رکھتے ہیں

ہر انجمن میں الگ سے دکھائی دیتے ہیں
کوئی فضا ہو ہم اپنی اڑان رکھتے ہیں

ہمیں کسی شجر راہ پر بھروسہ نہیں
کسی کی زلف کو ہم سائبان رکھتے ہیں





دوا کے نام سے حالت خراب ہوتی ہے
علاج سے مری صحت خراب ہوتی ہے

جب اور مجھ پہ مسیحا توجہ دیتا ہے
کچھ اور میری طبیعت خراب ہوتی ہے

چراغ راہ کے بجھنے سے کچھ نہیں ہوتا
یہ شام کوئے ملامت خراب ہوتی ہے

یہ سوچ کر، نہیں کوئی جہان کا مالک
کبھی کبھی مری نیت خراب ہوتی ہے

خدا کے واسطے تفریق و جمع کر نہ یہاں
فضائے شہر محبت خراب ہوتی ہے

یہ کار عشق ہے یاں اک گھڑی کی غفلت سے
تمام عمر کی محنت خراب ہوتی ہے

دیار عشق میں ملتی ہے سرخروئی اسے
کہ جس کی جتنی بھی عزت خراب ہوتی ہے



خشکی لب سے نہ آنکھوں کی تری سے آیا
جو بھی کام آیا ہمیں، بے ہنری سے آیا

جس ستارے کی تگ و دو میں ہوئی عمر تمام
وہ مرے پاس بڑی بے خبری سے آیا

○

سوچنا کیا، کہاں اٹھا لایا
اب تو میں آشیاں اٹھا لایا

ہم کہاں آنے جانے والے تھے
ابر نا مہرباں اٹھا لایا

میں تو چپ تھا مگر وہ قصہ ہجر
وصل کے درمیاں اٹھا لایا

رات وہ میرا یار دیرینہ
اک نئی داستاں اٹھا لایا

میں ترے گلشن تذبذب سے
فیصلے کی خزاں اٹھا لایا

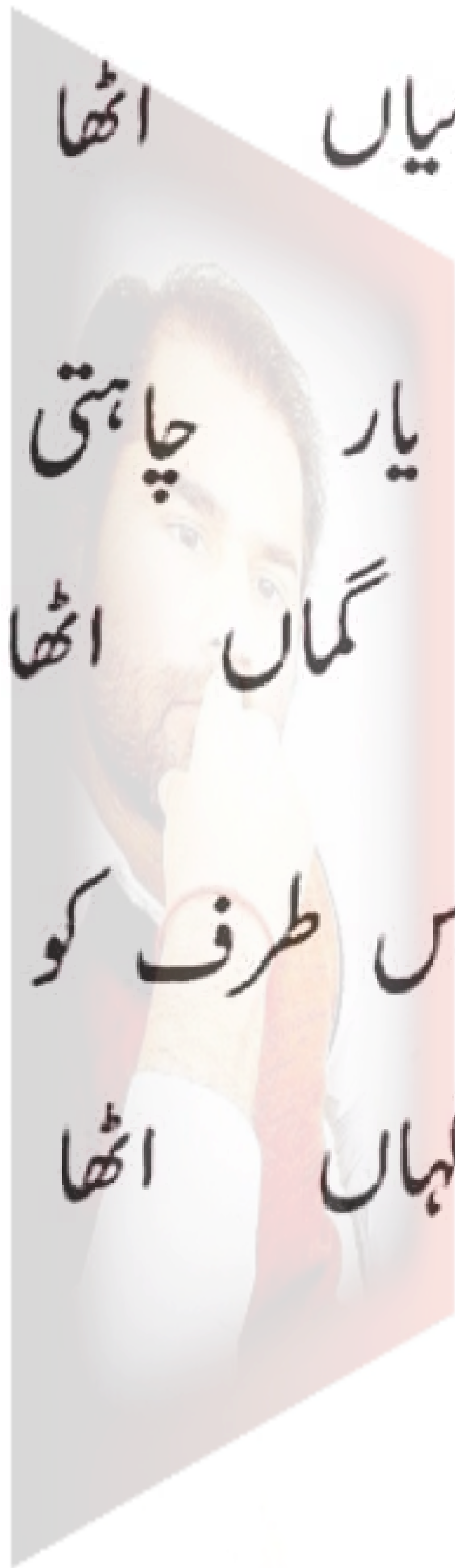
اس نے پوچھا تھا کیا شکایت ہے؟
میں یہ کون و مکاں اٹھا لایا

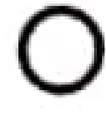
وہ زر چشم لے کے نکلا تھا
شہر کی ہر دکاں اٹھا لایا

لانا مشکل وہاں سے تھا خود کو
جیسے تیسے میاں اٹھا لایا

عقل اثبات یار چاہتی تھی
دل وہ شاطرؔ گماں اٹھا لایا

میں نہ آتا تھا اس طرف کو جمال
دل مجھے ناگہاں اٹھا لایا





کسی بھی بات کا جب اعتبار مشکل ہے
پھر ایسے میں یہاں رہنا تو یار مشکل ہے

کچھ اور وسعتیں درکار ہیں محبت کو
وصال و ہجر پہ دارومدار مشکل ہے

کہ مسکرانا بھی پڑتا ہے فاتحانہ ہمیں
ترے شکستہ دلوں کی ہزار مشکل ہے

سر ریاست الفت نظام ہے ایسا
کوئی ملے یہاں بے روزگار مشکل ہے

ادھار خواب خریدیں اور آنکھ بیچیں نقد
یہ کاروبار ہے اور کاروبار مشکل ہے

تو کن فضاؤں میں ہے، اے رقیب عیش پسند
تری خزاں سے ہماری بہار مشکل ہے

نہ اس کو چومیں تو رستہ بھٹکتی ہیں سانسیں
اور اس کو چومنا بھی بار بار مشکل ہے

اب اس کو ملنے لگے عاشقان جز وقتی
لہٰذا اپنا شمار و قطار مشکل ہے



○

پہلے تو خاکدان بنانے کا دکھ ہوا
پھر آسمان کو مرے جانے کا دکھ ہوا

رویا ہوں ایک ہستی نادیدہ کے حضور
مٹی میں آنسوؤں کو ملانے کا دکھ ہوا

لوگوں کو بھی ملال ہوا میرے حال پر
مجھ کو بھی داستان سنانے کا دکھ ہوا

صحرا بہت نڈھال مری تشنگی سے تھا
دریا کو میری پیاس مٹانے کا دکھ ہوا

پتھر سے آرزوئے وفا شیشہ گر کو ہے
یہ دکھ تو سارے آئینہ خانے کا دکھ ہوا

تیرے وفا پرستوں میں کچھ وہ بھی ہیں جنہیں
دنیا سے تیرے ہاتھ ملانے کا دکھ ہوا

O

میں وہاں سر کے بل رسائی کی
میر نے جس جگہ خدائی کی

بادشاہوں کو رشک آتا ہے
میں نے جس شان سے گدائی کی

یہ خرابہ کبھی کا مٹ جاتا
عشق والوں نے کچھ بھلائی کی

کس میں یہ حوصلہ، بہ جز عشاق
جب بھی کی اپنی ہی برائی کی

میرے ہم مکتبوں کو علم نہیں
وصل اک مشق ہے جدائی کی

خاطر یار پر نہ بار ہوئے
خود وفا خود ہی بے وفائی کی

رزق کا ڈر رفو گروں کو ہوا
اس نے زخموں کی جب سلائی کی

قیس و فرہاد کی تڑپ برحق
میں نے تو صبر آزمائی کی

چھو کے بھاگی تھی اس کو باد نسیم
میں نے گلشن میں جا لڑائی کی

میرے اور اس کے درمیاں ہے جمال
دھند ہی دھند آشنائی کی

میرا کوئی پرتو میرے ثانی میں نہیں تھا
جو لفظ میں تھا اس کے معانی میں نہیں تھا

رکھتا تھا کہیں پاؤں تو پڑتا تھا کہیں پاؤں
شاید میرا کردار کہانی میں نہیں تھا

تنہائی سی تنہائی تھی دریا کے کنارے
اس رات میرا عکس بھی پانی میں نہیں تھا



○

مکاں گرا دیا میں نے، یہ کیا کیا میں نے
نشاں مٹا دیا میں نے، یہ کیا کیا میں نے

گزشتہ عشق کے ہر دکھ سے ماسوا ہے یہ دکھ
تجھے بھلا دیا میں نے، یہ کیا کیا میں نے

خبر نہیں تھی، وہ آنے میں دیر کر دے گا
دیا بجھا دیا میں نے، یہ کیا کیا میں نے

○

ہمیں بھلائی ہوئی داستاں میں چھوڑ آتے
کوئی دیا ہی اندھیرے مکاں میں چھوڑ آتے

بزرگ رحم تو کھاتے کہ تھا میں بے پر و بال
خود آتے مجھ کو مگر آشیاں میں چھوڑ آتے

کسی کو کارِ عبث سے نجات دلواتے
کسی کو سایۂ ابر گماں میں چھوڑ آتے

میں بے نیاز گناہ و ثواب تو رہتا
مجھے عبادت شغل بتاں میں چھوڑ آتے

اب ایسی بے سر و سامانی مسافت کیا
تھکن بھی کیا سفر رائیگاں میں چھوڑ آتے

جمالؔ سہل طریقہ تھا جاں بچانے کا
ہم آتے اس کو کہیں درمیاں میں چھوڑ آتے

○

محفل میں تجھ کو غیر سے وابستہ دیکھ کر
چپ ہیں ترا تکلف برجستہ دیکھ کر

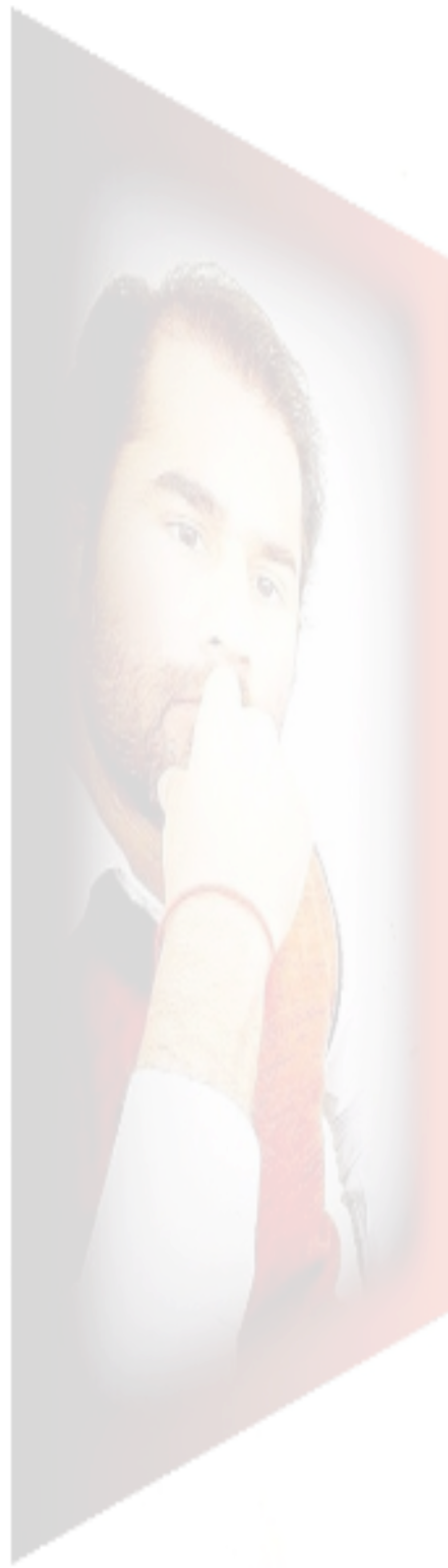
آنکھوں سے عمر بھر کے لیے نیند اُڑ گئی
اک خواب کو خیال سے پیوستہ دیکھ کر

شکوے بھی بے شمار تھے اظہار بھی بہت
خاموش ہو گئے تجھے دل بستہ دیکھ کر

ہوتا ہے اس پہ اس لیے آسان ہر سفر
چلتا نہیں مسافرِ دل، رستہ دیکھ کر

خوش بھی ہوا ہوں اپنی دعا کے اثر سے میں
دکھ بھی ہوا ہے حال ترا خستہ دیکھ کر

سارے مریض اپنا مرض بھولنے لگے
اس کے حنائی ہاتھ میں گل دستہ دیکھ کر





یہاں سے دور کہیں اک نگر بنایا جائے
قلم سے اب کسی کاغذ پہ گھر بنایا جائے

میں جس کے سائے میں گرمی کی دوپہر کاٹوں
وسیع صحن میں ایسا شجر بنایا جائے

جہاں پہ سردی کی شاموں میں بیٹھیں یار آ کر
اک ایسا کمرا الگ بام پر بنایا جائے

کسی کا قامت زیبا نگاہ میں رکھنا
جب اس مکان کی ڈیوڑھی میں در بنایا جائے

سنہرے رنگ بھرے جائیں طاقچوں کے بیچ
پھر اک چراغ ہر اک طاق پر بنایا جائے

کسی شکستہ مسافر، کسی گدا کے لیے
چبوترا کوئی بیرون در بنایا جائے

سحر کی پہلی کرن آئے جس دریچے سے
تمام رات اسے جاگ کر بنایا جائے

منور اتنی ہوں پیشانیاں مکینوں کی
یہ سوچنا پڑے، سورج کدھر بنایا جائے

بنائے جائیں مکیں ایسے کچھ سلیقے سے
بلند سب سے بڑے ہی کا سر بنایا جائے

جمالؔ آنکھ کھلی میری، سانس رکنے سے
اب اک ہجوم مری قبر پر بنایا جائے

○

نہ گزرتا تھا پر گزارا ہے
ہجر جو عمر بھر گزارا ہے

ان دنوں عشق سے معطل ہوں
نصف تنخواہ پر گزارا ہے

ایک پل کے لیے ملا تھا وہ
ایک پل عمر بھر گزارا ہے

تو نے دیکھا ہے صرف اور میں نے
موسم بے ثمر گزارا ہے

وہ کڑی دھوپ ہے کہ پتوں کا
شاخ سے ٹوٹ کر گزارا ہے

پیش محبوب آنکھ اٹھائی نہیں
کچھ گلہ بھی اگر گزارا ہے

عشق کے بیوپاریوں کا جمالؔ
صرف نقصان پر گزارا ہے



کیا بات تری زلف پریشاں نے لگائی
اک آگ سی بستی میں بیاباں نے لگائی

دو چار قدم دور تھا دیدار سے تیرے
جس وقت کہ کنڈی ترے درباں نے لگائی

○

ہم اپنے رنگِ سخن سے نکل کے دیکھتے ہیں
پھر اس کے بعد تماشے غزل کے دیکھتے ہیں

ہزاروں سال یہاں خستہ و خراب رہے
اب اس زمیں کو فلک سے بدل کے دیکھتے ہیں

کسی کے عشق سے کوئی سبق نہیں لیتا
یہ آگ وہ ہے کہ سب اس میں جل کے دیکھتے ہیں

جو دیکھتے ہیں سراپا نگاہ بن کے تجھے
کبھی کبھی کفِ افسوس مل کے دیکھتے ہیں

درِ چمن نہ کرو وا کہ بوالہوس ہیں یہ لوگ
کلی کو دیکھتے ہیں اور مسل کے دیکھتے ہیں

ذرا بیاں کا سلیقہ نہیں ہے یاروں کو
اور اس پہ خواب ہماری غزل کے دیکھتے ہیں

جمالؔ ہیرے کا جوبن ہے تاج میں پنہاں
اسے بھی اس کی گلی ہی میں چل کے دیکھتے ہیں



○

ترک بادہ ہے اور لمبی رات
آب سادہ ہے اور لمبی رات

میری آنکھیں ہیں اور دیوں کی قطار
تیرا وعدہ ہے اور لمبی رات

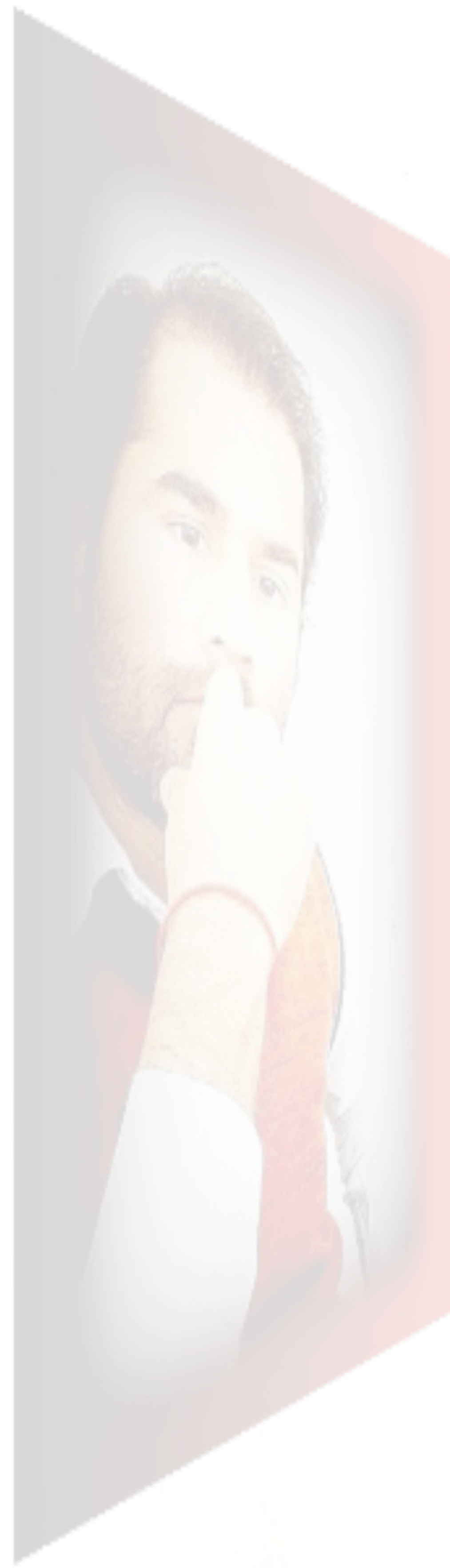
اوڑھ کر سو رہا ہوں خالی جام
کم لبادہ ہے اور لمبی رات

گل ہوا، مے کدے کا صدر چراغ
غم زیادہ ہے اور لمبی رات

صبح دم وہ دکھائی دے کہ نہ دے
اک ارادہ ہے اور لمبی رات

اک محل کی غلام گردشوں میں
شاہ زادہ ہے اور لمبی رات

آج گورِ کبیرؒ الاولیا پر
پیرزادہ ہے اور لمبی رات



○

تمنا کے مارے نہیں مل سکے
وہ ساتھی ہمارے نہیں مل سکے

بہت ہم نے چاہا مگر زندگی
ہمارے ستارے نہیں مل سکے

سبھی ایک اک کر کے اس سے ملے
ہمی بے قطارے نہیں مل سکے

ہماری سمجھ میں وہ سب آ گئے
ہمیں جو اشارے نہیں مل سکے

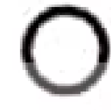
میں وہ نادہندہ کہ لمحات عشق
کہیں سے ادھارے نہیں مل سکے

کوئے یار میں ایسے بھی لوگ تھے
جو دامن پیارے نہیں مل سکے

یہ کس خاک داں میں بسر کی جمالؔ
نشاں بھی تمہارے نہیں مل سکے



روز حساب کچھ مری بخشش ہی ایسی تھی
حیراں تھے سب پہ میری سفارش ہی ایسی تھی



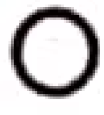
دل کی طرف دماغ سے وہ آنے والا ہے
یہ بھی مکان ہاتھ سے اب جانے والا ہے

اک لہر اس کی آنکھ میں ہے حوصلہ شکن
اک رنگ اس کے چہرے پہ بہکانے والا ہے

یہ کون آنے جانے لگا اس گلی میں اب
یہ کون میری داستاں دہرانے والا ہے

دنیا پسند آنے لگی دل کو اب بہت
سمجھو کہ اب یہ باغ بھی مرجھانے والا ہے

جو ساعت حسیں تھی وہ روکے نہیں رکی
یہ لمحہ بھی جمال گزر جانے والا ہے



ہجوم دل فگاراں کا عجب عالم کیا اس نے
کل اک بزم عزاداراں میں جب ماتم کیا اس نے

وہ رویا تھا کہ ایام عزا میں رونا نعمت ہے
کوئی میرے بچھڑ جانے کا تھوڑی غم کیا اس نے

مسیحاؤں کے چہروں پر ندامت کے پسینے تھے
مری حالت پہ جب اک اسم پڑھ کر دم کیا اس نے

وہ آنچل وہ سیہ آنچل جسے شام محبت میں
کبھی چادر کیا اس نے کبھی پرچم کیا اس نے

مری خانہ خرابی پر وہ آنکھ اس طرح بھر آئی
اک آنسو سے سمندر کو تری میں کم کیا اس نے

قسم کھائی ہے جھوٹی اس نے اک شام محرم کی
ہمارا کیا بگاڑا؟ نرخ اپنا کم کیا اس نے

اسی لمحے منور ہو گیا تھا وصل کا منظر
دیے کی لو کو جس انداز سے مدھم کیا اس نے

سپرد آب کرنے سے ذرا پہلے کا قصہ ہے
خود اپنے اشکوں سے میرا عریضہ نم کیا اس نے



○

یہ عجب فکر پڑی ہے مجھ میں
مجھ سے کیا چیز بڑی ہے مجھ میں

جس انا پر ہے تجھے اتنا گھمنڈ
وہ تو تجھ سے بھی بڑی ہے مجھ میں

مجھ سے ملنے نہیں دیتی مجھ کو
وہ جو دیوار کھڑی ہے مجھ میں

پھینکنے پڑ گئے ہتھیار مجھے
اس نے وہ جنگ لڑی ہے مجھ میں

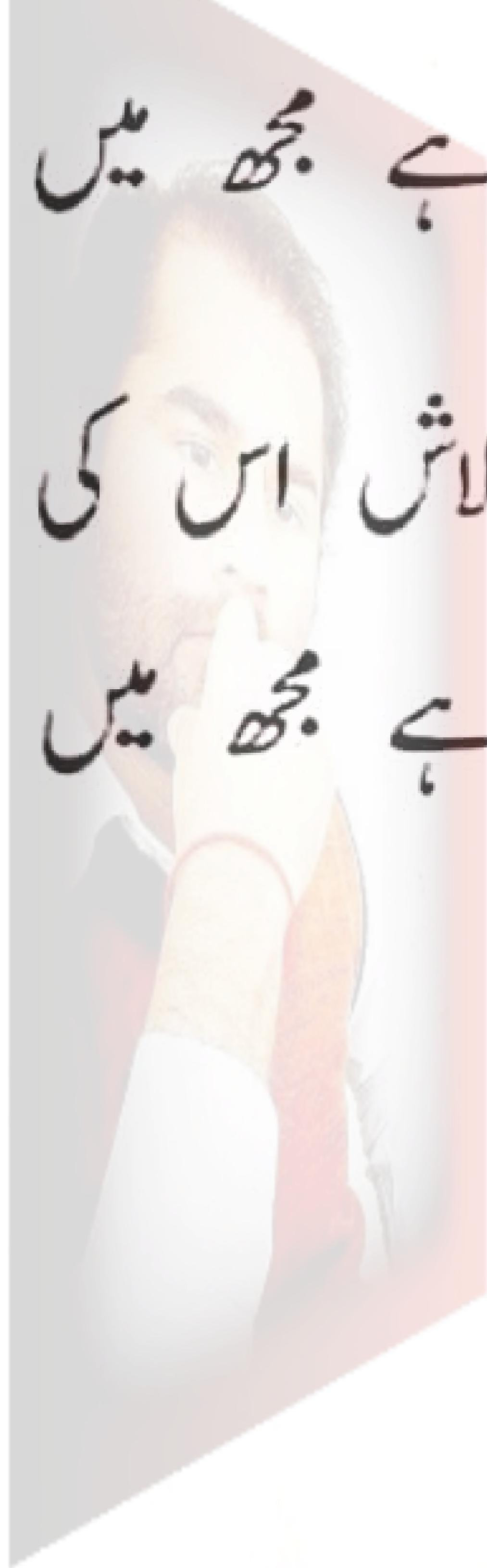
ہے کہیں کوئی مسیحا تو سنے
زیست بیمار پڑی ہے مجھ میں

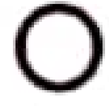
اس پہ ایمان بہت ہے میرا
اس سمے جو بھی گھڑی ہے مجھ میں

سائبان نگہ یار نہیں
ان دنوں دھوپ کڑی ہے مجھ میں

منتظر ہوں کہ کوئی آ جائے
ان دنوں فصل کھڑی ہے مجھ میں

میں نے مارا تھا جسے لاش اس کی
ایک مدت سے پڑی ہے مجھ میں





ویسے تو ہر زمانے کو حاجت ہے آپؐ کی
پر ان دنوں زیادہ ضرورت ہے آپؐ کی

کیسے مڑے گا بادِ تعصب کا رخ حضورؐ
آندھی کی زد پہ شمعِ اخوت ہے آپؐ کی

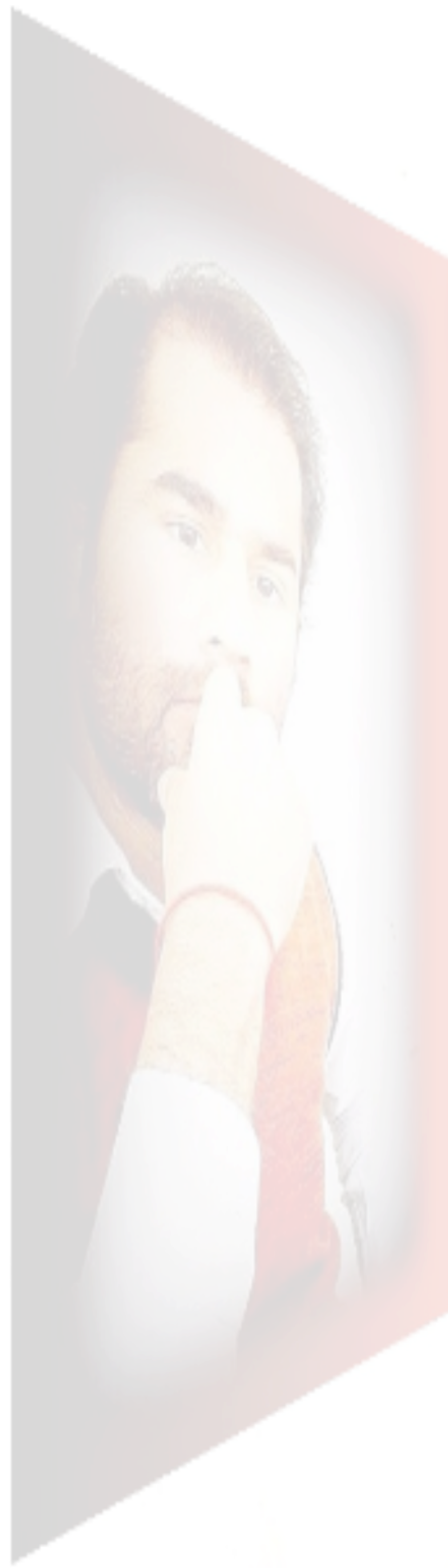
ان کو نسب کا پاس نہ ان کو شرف کا دھیان
یہ آلِ آپؐ کی ہے یہ امت ہے آپؐ کی

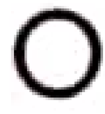
ہے آپؐ ہی کی ذات پسِ ہر نظامِ دہر
کوئی بھی سلطنت ہو حکومت ہے آپؐ کی

افسوس اس کے ہاتھ میں کشکول اب بھی ہے
جس قوم کو نصیب حمایت ہے آپؐ کی

کوئی مکین آپؐ سے مخلص نہیں یہاں
اس گھر پہ پھر بھی چشمِ عنایت ہے آپؐ کی

اپنی طرف سے چھوڑی نہیں ہم نے کچھ کسر
یہ ملک چل رہا ہے تو رحمت ہے آپؐ کی





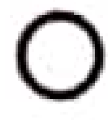
کیا حوصلہ دیا ہے خدا نے پڑے پڑے
لیتا ہوں دشمنوں کے نشانے پڑے پڑے

جتنی دوائیں میرے مسیحا نے مجھ کو دیں
بے کار ہو گئیں ہیں سرہانے پڑے پڑے

جو میری پائنتی سے نہیں رات بھر ہلا
اس کو سکون کیا ملا جانے پڑے پڑے

آنسو رکے تو اس نے مسیحا سے یہ کہا
کیا زنگ لگ گئے ہیں خزانے پڑے پڑے

صحت کا اپنی مژدہ سناتا ہوں روز اسے
گھڑنے لگا ہوں خوب بہانے پڑے پڑے



نشہ کچھ ایسا تھا کہ سمجھ میں نہ آئی بات
جب ایک روز بزم میں اس نے اٹھائی بات

یہ کائنات ورنہ کبھی کی تمام تھی
دو چار لوگ تھے کہ جنھوں نے بنائی بات

اک بات تھی جو میں نے کہی تھی بہ صد نیاز
لیکن یہ میری بات میں کس نے ملائی بات

دنیا جہاں کا ذکر کیا رات بھر مگر
اک دوسرے سے دونوں نے دل کی چھپائی بات

یہ سارا باغ اس کے رویے سے تنگ ہے
اس گل ہی نے بڑھائی ہے جب بھی بڑھائی بات

میں نے کہا زیادہ ہے مجھ کو دماغ کچھ
اس نے چمن میں جا کے صبا سے لگائی بات

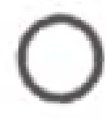
ہر بار صرف سر کو ہلاتا ہے نفی میں
اس سے تو کہہ کے ہم نے ہمیشہ گنوائی بات

چاہے جمالؔ دوسرے ہی کی زمین ہو
ہم نے تو جب سنائی ہے اپنی سنائی بات

یہ کون آیا تھا اس کوچے کی جانب
یہ کس کی چارپائی جا رہی ہے

کوئی کسی کے لیے اب دعا نہیں کرتا
یہ ہو رہا ہے پر ایسا ہوا نہیں کرتا

سمجھ میں آنے لگی ہے فضائے کوچۂ عشق
دل اب کسی سے ترا تذکرہ نہیں کرتا



سمجھا نہیں گیا جو مجھے گھر کا آدمی
مجھ میں بکھر گیا، مرے اندر کا آدمی

تاہم بھی اس سے پنجہ کشی کا اٹھائیں لطف
لاؤ کوئی ہمارے برابر کا آدمی

میں سبزہ و گلاب کے شجرے کا فرد ہوں
اور میرا ہم رکاب ہے پتھر کا آدمی

ہم اس کو آدمی ہی نہیں مانتے جمالؔ
جو آدمی ہو صرف مقدر کا آدمی

○

وہم نے مجھ میں بھی اک نقش ابھارا تھا کوئی
ان نگاہوں میں بھی ہلکا سا اشارہ تھا کوئی

تو نے محفل سے جب اٹھنے کا ارادہ باندھا
کیا تجھے یاد نہیں ہے کہ پکارا تھا کوئی

دیپ مدھم تھے سرِ بزم رقیب اور اس کی
جھلملاتی ہوئی آنکھوں میں ستارہ تھا کوئی

اس کے نزدیک پہنچ کر مجھے معلوم ہوا
وہ کسی دوسرے دریا کا کنارہ تھا کوئی

کس سے احوال بیاں کرتا تری محفل میں
دل گرفتہ تھا کوئی، درد کا مارا تھا کوئی

اس کے بھی جسم پہ آثار تھکن کے تھے بہت
میں نے بھی پہلے پہل بوجھ اتارا تھا کوئی

○

مجھ کو وہ بھی بسا غنیمت تھا
اس سے جو رشتہ شکایت تھا

اب یہ عقدہ کھلا کہ اس کے لئے
میں محبت نہیں ضرورت تھا

تو نے احساس ہی نہ ہونے دیا
جو بھی کچھ تھا، تری بدولت تھا

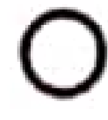
عشق کی ہر دکاں تھی گھاٹے میں
اپنا جب کاروبار وحشت تھا

جو بھی تھا، تھا وہ اپنا دشمن زیست
یہ کبھی شیوہ محبت تھا

وہ ہی تو ساعت جدائی تھی
وہ جو اک لمحہ رفاقت تھا

مجھ پہ اس چشم تر نے سہل کیا
ورنہ یہ عشق تو مصیبت تھا

میں نے وہ ہجر بھی گزارا ہے
جب ترا قرب بھی نہایت تھا



کس کو سمجھاؤں بھلا مجھ کو جو یار افسوس ہے
منتظر ہوں تیرا میں اور انتظار افسوس ہے

ایک بس تیرے نہ ہونے سے جہان خاک میں
بے پناہ افسردگی ہے بے کنار افسوس ہے

مجھ کو رہنے کے لیے جو باغ بخشا ہے وہاں
کیا خزاں کا ذکر کرتے ہو، بہار افسوس ہے

تیری موجودگی میں بیٹھا ہوں یہاں بے سائباں
زلف جاناں رنج ہے، اے چشم یار افسوس ہے

نکتہ یہ تعلیم اک کہنہ شرابی نے کیا
مے کشی ہے اک مسرّت اور خمار افسوس ہے

یہ ریاست عشق کی ہے، اس کے اپنے ہیں اصول
بے قراری اس جگہ نعمت، قرار افسوس ہے

وہ مریض عشق ہوں روز ازل سے میں جمالؔ
جس کی حالت پر مسیحا کو ہزار افسوس ہے



سید حسین احسن

دل کو امید کہ وہ جام بنا کر دے گا
اور پھر وصل کے ہنگام بنا کر دے گا

اس نے اک لمحہ کمزور میں یہ وعدہ کیا
میرا بگڑا ہوا اک کام بنا کر دے گا

بیٹھ کر خوبیاں اپنی ہی نکالی جائیں
کیوں بھلا نیکیاں دریاؤں میں ڈالی جائیں

پیش احباب رہے میرا دریدہ ملبوس
پگڑیاں جب سرِ بازار اچھالی جائیں

صرف شہزادیوں پر شاہ کا اصرار ہے کیوں
کچھ کنیزیں بھی تو دشمن سے چھڑالی جائیں

اب تو میں کھینچ چکا دستِ مروّت اپنا
دیکھ اس بار تر وار نہ خالی نہ جائیں

جون ایلیا کی نذر

میں اس دنیا میں یوں اتنا رہا نئیں
یہ سب کچھ ہے مگر رہنے کی جا نئیں

نہ رہنا خوش گماں شجرے سے میرے
کہ مجھ پر باپ کا سایہ پڑا نئیں

میانِ وصل مت کر شکوۂ ہجر
اب اس پانی میں تو مٹی ملا نئیں

رقیب من فسردہ ہار پر تھا
وہ منظر مجھ سے تو دیکھا گیا نئیں

کوئی تو بات اس کم رو میں ہو گی
یونہی یہ شہر دیوانہ ہوا نئیں

خدا مانا تجھے اس دور میں بھی
میں اپنی بات سے پیچھے ہٹا نئیں

یہ سب زخموں کے بڑھنے سے ہوا ہے
میں جیسا ہو گیا ہوں ایسا تھا نئیں

خدا سے ہیں بہت مایوس ہم لوگ
اب اس سے آگے کوئی راستہ نئیں

تری دیوار سے جھگڑا ہے میرا
تیری دیوار کا سایہ برا نئیں

کہاں کشکول لے کر پھر رہے ہو
میری آنکھوں کی ویرانی میں کیا نئیں

○

تو اپنے وصل کے وعدے سے جب مکرنے لگا
تو میں نے دیکھا ترا پیرہن بکھرنے لگا

جب آدھی رات کو ساری شراب ختم ہوئی
وہ اپنی آنکھ سے میرا پیالہ بھرنے لگا

اسے غزل سے کسی طور کم نہیں چاہا
سو وہ بھی قافیے کی طرح تنگ کرنے لگا

ہوائے صبح نے ہم دونوں کو اُداس کیا
جمال پیڑ سے اِک سایہ جب اُترنے لگا

○

کچھ سرِ رہ گزر نہیں ہوتا
وہ کسی روز اگر نہیں ہوتا

کچھ نہ کچھ اس زمیں پہ ہر لمحے
ہوتا رہتا ہے پر نہیں ہوتا

اس گھڑی بھی میں اس کو دیکھتا ہوں
جس گھڑی بام پر نہیں ہوتا

پہلے میں بھول جایا کرتا تھا
اب تو کچھ درگزر نہیں ہوتا

اب کسی شخص کے بچھڑنے کا
دل پہ کوئی اثر نہیں ہوتا

○

کہنی ہے ایک بات دل شاد کام سے
تنگ آ گیا ہوں یار، محبت کے نام سے

میں ہوں کہ مجھ کو دیدہ بینا کا روگ ہے
اور لوگ ہیں کہ کام انہیں اپنے کام سے

عشاق ہیں کہ مرنے کی لذت سے ہیں نڈھال
شمشیر ہے کہ نکلی نہیں ہے نیام سے

جب اس نے جا کے پہلوئے گل میں نشست کی
باد صبا بچھڑ گئی اپنے خرام سے

وحشت اک اور ہے مجھے ہجرت سے بھی سوا
ہم خانہ مطمئن نہیں میرے قیام سے

میری تو بات اور ہے وہ خوش نہیں کہ جو
ہم رنگ ہو گئے در و دیوار و بام سے

پانی تھا وہ سو اس کا مقدر ہوا بنی
میں آگ تھا سو خاک ہوا اہتمام سے

ہر اسم بے طلسم تھا لیکن جمال میں
تارے کو ماہ تاب کیا اس کے نام سے



عمارت دل کی جو ڈھائی گئی ہے
بہت تکلیف فرمائی گئی ہے

کبھی ناپید تھی جنس محبت
یہ اب بازار میں لائی گئی ہے

○

کسی جزو میں کل نہیں ہے میاں
یہ سچ ہے، تجاہل نہیں ہے میاں

جب آئے تو وقت مقرر پہ آ
مجھے کچھ تحمل نہیں ہے میاں

بہت دکھ اٹھا کر لکھے ہیں یہ شعر
کسی سے تقابل نہیں ہے میاں

مری سانس کی آمد و رفت ہے
یہ زنجیر کا غل نہیں ہے میاں

مری آنکھ کے سارے دریا ترے
یہاں دیکھ لے پل نہیں ہے میاں

مرے خانہ دل میں آباد رہ
یہاں روشنی گل نہیں ہے میاں

یہ اس بار کیسی بہار آئی ہے
کسی شاخ پر گل نہیں ہے میاں

جسے صبح و شام اپنا کہتے رہیں
حقیقت میں بالکل نہیں ہے میاں



کب سے میں تیرے، بچھڑ جانے کے منظر کو لیے
پھر رہا ہوں، اپنی آنکھوں میں سمندر کو لیے



زمین کا مکین، آسماں سے یاد آ گیا
وہاں سے یاد کر لیا جہاں سے یاد آ گیا

میں اس کا پہلا اور آخری سرا تو ڈھونڈ لوں
جو قصہ عجیب درمیاں سے یاد آ گیا

سحر سے شام، گیند کھیلتا تھا جس کے ساتھ میں
کسی پرانے زخم کے نشاں سے یاد آ گیا

تم اس نگر کی روز سیر کرنے آتے ہو سو آج
جمالؔ خستہ و خجل کہاں سے یاد آ گیا

○

ہر شے کے بدل گئے معانی
جب بھی تجھے بھولنے کی ٹھانی

تا ہو نہ دروغ و حق کی تمیز
گدلا دیا اس نے سارا پانی

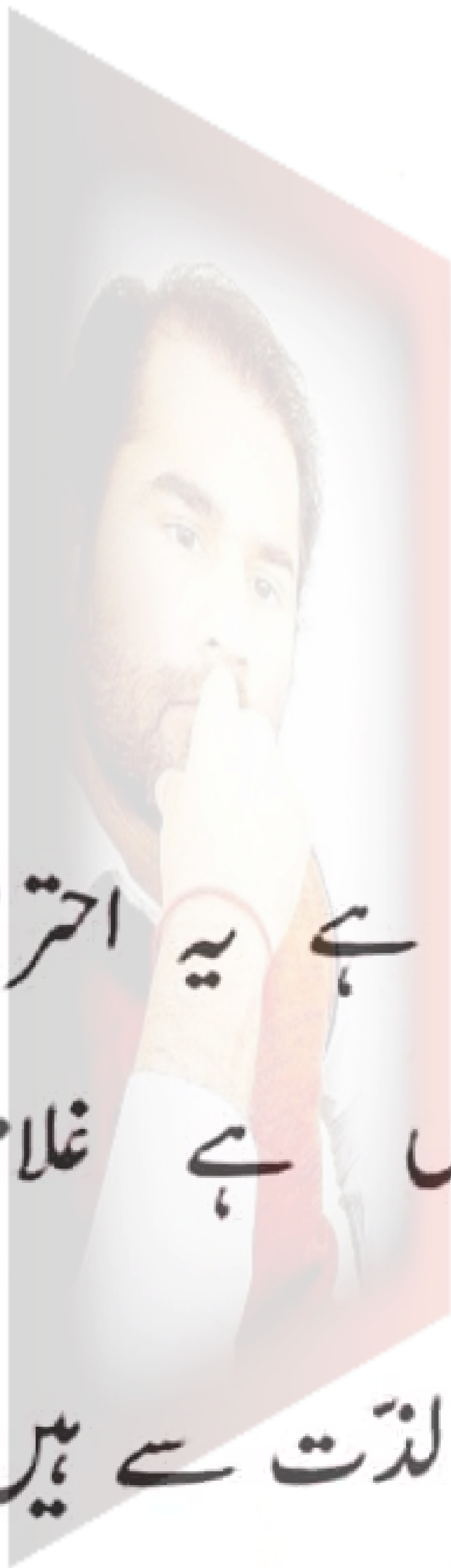
وہ بھی شب و روز تھے کہ جب تھے
یاد اس کے نقوش منہ زبانی

میں اس کو ستارہ کر رہا تھا
اس نے مری بات ہی نہ مانی

شہروں کی طرف نکل گئے ہیں
صحراؤں کی رونقوں کے بانی

کچھ یاد ہے شام کو ترے ساتھ
میں تھا کہ مرا وجود ثانی

ہر چیز کو اس جگہ فنا ہے
اک تیرا نہ ہونا جاودانی



اے شاہ حسن عرض ہے یہ احترام سے
اتنا گریز اچھا نہیں ہے غلام سے

عشّاق ہیں کہ مرنے کی لذّت سے ہیں نڈھال
شمشیر ہے کہ نکلی نہیں ہے نیام سے

اس کے سوا سمٹ نہ سکوں گا کسی سے میں
جس آنکھ نے بکھیرا مجھے انتظام سے

○

مرا قصیدہ اسی مہرباں کے واسطے ہے
جو ایک اسم ہے اور دو جہاں کے واسطے ہے

وہ کائنات کی تکمیل ہیں اور ان کے سوا
کچھ اور ہے تو وہ حسن بیاں کے واسطے ہے

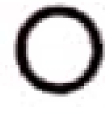
میں راہ عشق محمدؐ میں کھونا چاہتا ہوں
مرا سفر مرے نام و نشاں کے واسطے ہے

بھٹکنا چاہوں بھی میں تو بھٹک نہیں سکتا
زمیں کہیں بھی رہے آسماں کے واسطے ہے

○○○

سایہ سا کوئی رات برابر میں پڑا تھا
شاید میں کسی دوسرے بستر میں پڑا تھا

جتنے بھی مکیں تھے وہ کنارے پہ کھڑے تھے
عکس ان کے مکانوں کا سمندر میں پڑا تھا



صفت درویش کی، لہجے دوانے والے رکھتا ہے
مگر انداز وہ سارے زمانے والے رکھتا ہے

ہمیں بھی دشمنی ہے باپ دادا کے زمانے سے
سو وہ بھی بغض دل میں کچھ پرانے والے رکھتا ہے

جہاں مامور کرتا ہے خدا تخریب کاروں کو
وہاں دو چار وہ بستی بسانے والے رکھتا ہے

تمنا ہم بھی اس کو یاد رکھنے کی نہیں کرتے
ارادے وہ بھی ہم کو بھول جانے والے رکھتا ہے

جمالؔ اشعار اٹھتے ہی نہیں اس کے کسی صورت
اگرچہ ساتھ وہ مصرعے اٹھانے والے رکھتا ہے

○

عادت شب بیداری بڑھتی جاتی ہے
جب سے گریہ و زاری بڑھتی جاتی ہے

زیست میں جب سے در آئی ہے اک ترتیب
سانس کی ناہمواری بڑھتی جاتی ہے

اس کی انا بھی کم نہیں ہوتی پل بھر کو
میری بھی بیماری بڑھتی جاتی ہے

جس کو خبر ہے، اس کو نہیں ہے کوئی غرض
کیوں میری مے خواری بڑھتی جاتی ہے

حالت یہ ہے میل نہیں کچھ دونوں میں
صورت یہ ہے، یاری بڑھتی جاتی ہے

پہلے جو ناممکن تھا ممکن ہے اب
میری تو دشواری بڑھتی جاتی ہے

○

حالت وہ اپنی ہے کہ دل و جاں بہم نہیں
ایسے میں تیری آرزو رکھنا بھی کم نہیں

کہنے کو اس کا لطف بھی ہر چند کم نہیں
لیکن اب اس کے بوسہ لب میں وہ دم نہیں

ایسا ہے دل میں تیری طرف سے غبار ہے
ایسا نہیں کہ تجھ سے بچھڑنے کا غم نہیں

مجھ میں تری جدائی کا موسم ٹھہرنے سے
عالم وہ دل کا ہے کہ مری آنکھ نم نہیں

کیا دیکھتا ہوں آدھی مسافت گزار کے
وہ میرا ہم سفر ہے، مرا ہم قدم نہیں

جاتے نہیں ہیں ہم کسی تقریب میں کہیں
شاید وہ اس لیے وہاں آئے کہ ہم نہیں

○

پانی کی نقش پا سے وہ رنگت نکھارے ہے
اس کا خرام دیدہ تری میں ہمارے ہے

گر جائے تو زمیں کو فلک تک اچھال دے
جو اشک آج اس کی پلک کے کنارے ہے

دل کو نہیں ہے شہر کی رونق میں کچھ قرار
دریا کی طرح دشت میں یہ موج مارے ہے

جیسے ہماری وجہ سے یہ عہد ہے خراب
ہم پر زمانے بھر کا وہ غصہ اتارے ہے

پھر کیا تمہیں بتائیں نشیب و فراز عشق
کرنا وہی ہے تم کو جو دل میں تمہارے ہے

○

تیر جن کے سینوں پر شب بھر چلے
صبح اپنے اپنے کاموں پر چلے

حکمت و منشائے چارہ گر ہے یہ
نبض بیماروں کی رک رک کر چلے

اس قدر مشکل ہوا ایفائے عہد
لوگ اپنے آپ سے باہر چلے

ہے وہ مہنگائی سر بازار عشق
شام کو سب اپنے اپنے گھر چلے

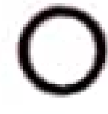
تو نے جب دل توڑ کر ہی رکھ دیا
پھر یہ سکہ کن دکانوں پر چلے

کس نے آ کر گھاٹ پر باندھی ہے ناؤ
آنکھ میں ٹھہرے ہوئے منظر چلے

آسمانوں کے تلے بیٹھا ہی رہ
جب تلک افسون چشم تر چلے



رات سونے کے لیے دن کام کرنے کے لیے
وقت ملتا ہی نہیں آرام کرنے کے لیے



نفرت نہ دی مجھے کہ محبت نہ دی مجھے
اس نے کسی بھی طرح کی زحمت نہ دی مجھے

میرے لہو سے حسن کی آرائش اس نے کی
اور اس کے بعد کوئی اجازت نہ دی مجھے

اک روگ ہے یہ نصف حقیقت مرے لیے
آئینہ دے دیا گیا، حیرت نہ دی مجھے

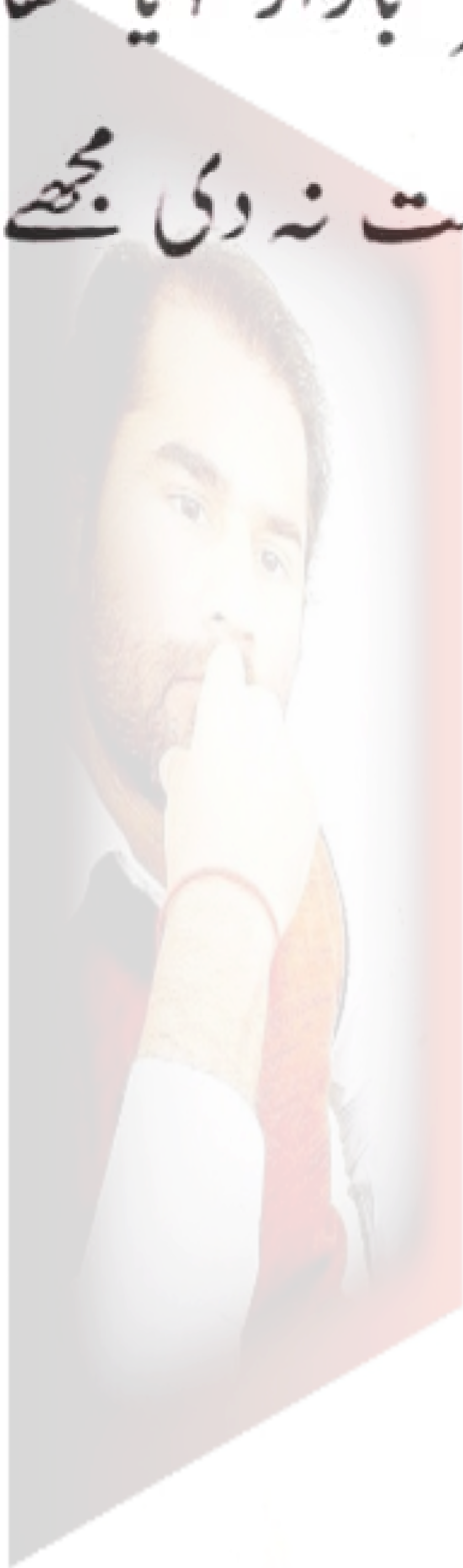
جس کے طفیل کام سے میں جی چراتا تھا
اس نے پلک جھپکنے کی فرصت نہ دی مجھے

کیا اور اس سے مانگتا جس نے تمام عمر
تجھ سے بچھڑ کے جانے کی ہمت نہ دی مجھے

جس نے مجھے زیادہ رکھا، آب و خاک سے
شایان شان اس نے بھی عزت نہ دی مجھے

یہ پوری کائنات دی زیرنگیں مرے
لیکن ذرا سے صبر کی طاقت نہ دی مجھے

گاہک اک ایسا بھی سرِ بازار آیا تھا
جس نے خرید کے مری قیمت نہ دی مجھے



ہیں زمیں کے نہ آسماں کے ہم
جس جگہ ہیں، نہیں وہاں کے ہم

○

چاند اس ساتھ ستارہ مرے ساتھ
کوئی کرتا یہ نظارہ مرے ساتھ

اجنبی تھا پہ سر منزل ذات
اس نے سامان اتارا مرے ساتھ

ہو گئی باغ کی حالت کیسی
چل کے دیکھو تو خدارا مرے ساتھ

شور و غل کرتا ہے دریا ہر پل
چلتا ہے ایک کنارہ میرے ساتھ

اس میں بھی مجھ سے نہیں ملتا تھا
اس نے جو وقت گزارا مرے ساتھ

عید تہوار کے ملنے والو
رشتہ بھی کیا ہے تمہارا مرے ساتھ

شہر کو خوب خبر ہے کہ وہ شخص
دیکھا جائے گا دوبارہ مرے ساتھ

میرے چہرے، مری آنکھوں کے سوا
کون اٹھاتا ہے خسارہ مرے ساتھ

ٹھوکریں کھاتا ہوا پھرتا ہے
میری قسمت کا ستارہ مرے ساتھ

میں نے جب شعر سرِ بزم پڑھے
نہ ہوا وہ مرا پیارا مرے ساتھ

کوئی طوفان ہو رہتا ہے جمالؔ
ایک دریا کا کنارہ مرے ساتھ

O

قربتوں میں کوئی راحت نہ کسی دوری میں
جان ہلکان ہوئی عشق کی مزدوری میں

تجھ سے اب کوئی توقع نہیں پر بیٹھے ہیں
ہم ترے سایہ دیوار کی مجبوری میں

ایک بیمار تمنا کا سہارا لے کر
تجھ تلک چلتے ہوئے آئے ہیں معذوری میں

دیکھنے والوں نے یکجان سمجھ رکھا تھا
اور ہم ساتھ نبھاتے رہے مجبوری میں

تم نے اس بات کی گر اس سے اجازت چاہی
عمر لگ جائے گی اس بات کی منظوری میں

ان دنوں شہر کی کچھ ایسی فضا ہے کہ جمالؔ
گھر سے جاتے ہیں نکل کے بڑی مجبوری میں

○

اک بوجھ رکھا ہے سینے پر
جیسے کوئی سانپ خزینے پر

صحرا کی سمت نکل آئے
دو دریا ایک سفینے پر

میں آگ بدلنے ٹھہرا ہوں
لکڑی کے بنے ہوئے زینے پر

وہ کچھ بھی نہیں سنتا میری
جو مجھ میں بہ ضد ہے جینے پر

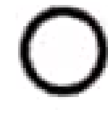
مرے بازو مجھ سے منگوا کر
مجھے بھیج دیئے ہیں کسی نے پر

چہرے کا چراغ نہیں جلتا
ہے ایسی دھند آئینے پر

جس کی باتوں پر کڑھتا ہوں
مرتا ہوں اسی کمینے پر

کچھ اور سوا ہو جاتا ہے
ہر قرض جمال مہینے پر





جو دکھائی دیتا ہے ایسا ہے کیوں
ہر قدم پر سوچ یہ دنیا ہے کیوں

کچھ رموز آب و گل پر غور کر
ہے یہ صحرا کس لیئے دریا ہے کیوں

رات کی تہہ میں چھپا ہے کیسا خوف
شام ہی سے اک دیا جلتا ہے کیوں

جسم کے ہر راز کو مت راز رکھ
ذات کے اظہار سے ڈرتا ہے کیوں

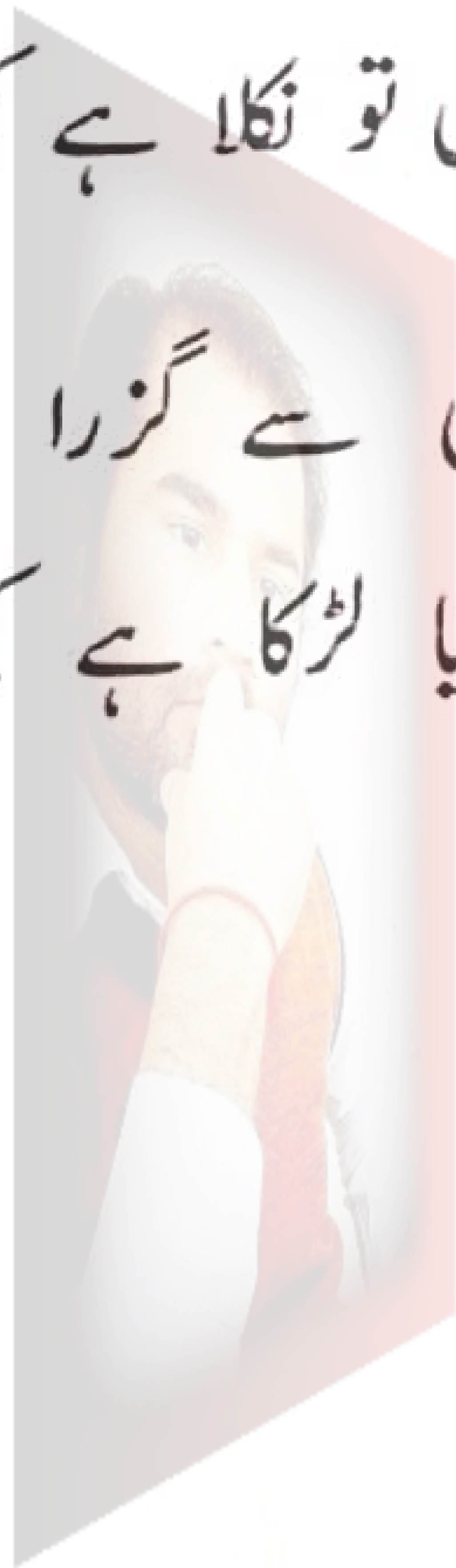
کاٹ دے اس ہاتھ کے کشکول کو
اپنے آگے ہی سہی، پھیلا ہے کیوں

زندگی اور موت یکساں ہیں اگر
درمیاں پھر سانس کا جھگڑا ہے کیوں

راز ابھی یہ بالا از ادراک ہے
اس خرابے میں کوئی ہنستا ہے کیوں

جمع کر اب ہر قدم پر آبلے
گھر سے ننگے پاؤں تو نکلا ہے کیوں

مدتوں بعد اس گلی سے گزرا میں
اس دریچے میں نیا لڑکا ہے کیوں



سلیم کوثر کے نام

یہ ظلم مرے چاہنے والے نہیں کرنا
دیکھو مجھے دنیا کے حوالے نہیں کرنا

نزدیک سے دیکھو تو نظر آتا نہیں کچھ
اس شہر میں اب اور اجالے نہیں کرنا

پانی نہیں دینا مرے یادوں کے شجر کو
یہ کام مرے بھولنے والے نہیں کرنا

آئندہ سفر کے لئے رکھنا کوئی رستہ
کشتی کو سمندر کے حوالے نہیں کرنا

اس دل کی طرف آنے نہ دینا کوئی لشکر
اس شہر کو غیروں کے حوالے نہیں کرنا

ooo

میں سنگ گراں بار سے تھا معرکہ آرا
اور رزق مرا دوسرے پتھر میں پڑا تھا

○

اتفاق حسب نسب ہیں ہم
ورنہ اک دوسرے کے کب ہیں ہم

آخر آخر یہی سمجھ پائے
جس جگہ بھی ہیں بے سبب ہیں ہم

اس جہاں میں جواز کیا ڈھونڈیں
اپنے کنبے میں بے سبب ہیں ہم

دنیا والوں کے ڈر سے چپ ہیں جمالؔ
ورنہ اس خانداں کے کب ہیں ہم

○○○

کیا ذخیرہ کر لیا احباب نے
عشق کا بازار اب ٹھنڈا ہے کیوں

ان پہ تو ہر لمحے گرتا تھا پہاڑ
میر صاحب کی طرح روتا ہے کیوں

○

اس گلی میں ہزار آئے ہیں
ایک ہم بے قرار آئے ہیں

عرضیاں اپنی جیب میں رکھے
تیرے بے روزگار آئے ہیں

جانے والوں کی یاد آئی ہے
جب بھی دن خوشگوار آئے ہیں

اہل خانہ سے بھی کبھی نہ کہا
کیسا ہم دن گزار آئے ہیں

عشق میں کوئی کام آیا نہیں
خود کو بھی کل پکار آئے ہیں

جو نہیں تھا ہمارے پاس جمالؔ
عشق میں وہ بھی وار آئے ہیں

○

گھر اپنا نہیں، گھر کی فضا اپنی نہیں ہے
چلتی ہے یہاں جو وہ ہوا اپنی نہیں ہے

جانے کے لیے در کئی دیوار کے اندر
رہنے کے لیے کوئی بھی جا اپنی نہیں ہے

کیوں عدل کی زنجیر ہلاتے ہو یہاں جب
جرم اپنا نہیں، اس کی سزا اپنی نہیں ہے

حیرت نہیں جو اہل سخاوت نہیں اپنے
حد ہے کہ قطار فقرا اپنی نہیں ہے

کھلتا ہی نہیں باب فضیلت کسی صورت
ہاتھ اپنے نہیں ہیں کہ دعا اپنی نہیں ہے

اخفا سے تو کچھ اور ہے ظاہر مرا احوال
جسم اپنا ہے پر اس پہ قبا اپنی نہیں ہے

دلداریاں

نہ اجنبی ہے کوئی اور نہ آشنا کوئی
اکیلے پن کی بھی ہوتی ہے انتہا کوئی

جمال احسانی کے اس شعر کی بلاغت اس کی زندگی اور شاعری کا احاطہ کرتی ہے۔ جمال کے شاعرانہ سفر کی شناخت اس شعر میں پوشیدہ ہے۔ اس کا شعری مجموعہ ستارہ سفر اس کے مستقبل کا سراغ دیتا ہے۔

(احمد ندیم قاسمی)

(لاہور میں ستارہ سفر کی تقریب اجرا کی صدارت کرتے ہوئے۔)

----O----

جمال احسانی اور ستارہ سفر، مجھے دونوں پسند ہیں۔ ستارہ سفر سے جمال کی شاعری کے بہتر مستقبل کا پتا چلتا ہے۔ مجھے جمال سے بہت مثبت توقعات کی امید ہے۔

(ڈاکٹر وزیر آغا)

(سرگودھا میں افتتاحی جلسے سے خطاب)

----O----

جمال احسانی صاحب کی شاعری سے اہل پاکستان تو یقینا+ محظوظ ہوتے ہی ہوں گے کہ انہیں یہ کتابی شکل میں بھی میسر ہیں مگر ہم اہل بھارت کے لیے ان کا کلام تبرک کی طرح ہے۔ جب وہ بھارت کے شاعروں میں اپنے کلام کی دھاک بٹھاتے ہیں تو یہاں کے بہت نامی گرامی چراغوں کا تیل میں نے کم ہوتے ہوئے دیکھا۔

(کیفی اعظمی)

----O----

پندرہ سترہ برس پہلے کی بات ہے، مجھے اپنے گھر کے بس اسٹاپ پر ایک لڑکا ملا۔ کچھ تامل کے بعد وہ نزدیک آیا اور مجھ سے پوچھا "کیا آپ سلیم احمد ہیں؟" میں نے اثبات میں گردن ہلائی تو لڑکے نے اپنا نام جمال احسانی بتایا اور کہا کہ وہ فون کے محکمے میں غالباً میکنیشن ہے اور دوسرے شہروں اور دیہاتوں میں ادب شعر کے ساتھ ساتھ اپنا رزق بھی کماتا ہے۔ جمال نے شام کو میرے گھر آنے کی اجازت چاہی جو میں نے بہ خوشی دے دی۔ اس بات کو زمانے گزر گئے۔ جمال اس شام ایسا آیا کہ پھر کبھی نہ گیا۔ کبھی کدھر کو نکل بھی جاتا ہے اور لوگ میری توجہ ادھر مبذول بھی کراتے ہیں، میں کہہ دیتا ہوں "ہاتھی پھرے گاؤں گاؤں، جس کا ہاتھی اس کا ناؤں۔"

(سلیم احمد)

----O----

جمال احسانی کا نام ہمارے عہد کی شاعری کا ایک اہم نام ہے اور ہماری شاعری اب بین الاقوامی سرحدوں تک پہنچ چکی ہے۔ جمال احسانی کا نام اردو شاعری کی روایت سے آگہی کی ضمانت ہے۔ صورت حال یہ ہے کہ منیر نیازی، زہرہ نگار اور جمال احسانی ہماری شاعری کے تابناک ستارے ہیں جمال احسانی کی شاعری صرف جمال کا ذاتی اظہار نہیں بلکہ اس شاعری میں اس کا پورا وجود بولتا ہے۔ وہ وجود جو اس کی روح، اس کے معاشرے اور اس کے چلتے پھرتے ہنگاموں کے ساتھ ہے اس کی انوکھی اور روایت سے باخبر شاعری تو بس ساقی فاروقی جیسا شاعر ہی کرسکتا ہے ویسے آج کے عوام اور خواص تو اسے اپنا شاعر سمجھتے ہی ہیں۔

(قمر جمیل)

----O----

جمال احسانی کی خوبصورت شاعری کی تعریف میں قریباً بیس بائیس سال پہلے کر چکا ہوں۔ اس شاعر نے مجھے آج تک مایوس نہیں کیا۔ اس پر شاعری کی دیوی مہربان رہتی ہے۔ یہ اپنے بہت سے نامی گرامی اور سینئر شعرا سے زیادہ شاعر ہے۔ ایک بار جمال کو ملازمت میں انٹرویو کے لیے سرٹیفکیٹ کی ضرورت تھی، اس نے میری رائے کو اہمیت دی اور اسے نوکری مل گئی۔ یہ اہم فیصلہ وہی کر سکتا ہے جسے اپنے

آپ پر اور اپنی شاعری پر بے انتہا اعتماد ہو۔ میں جمال کے اسی شاعرانہ اعتماد کو تسلیم کرتا ہوں۔

(منیر نیازی)

----O----

منیر نیازی نے کہا ہے کہ جمال احسانی مجھ سے کہیں بہتر شاعر ہے۔ مجھے منیر نیازی سے اختلاف ہو سکتا ہے مگر میں اس کی تصدیق کے لیے جمال کو ایک بار مزید پڑھوں گا۔

(احمد فراز)

----O----

شاعری، جمال کی صفت نہیں بلکہ وہ اس کی ذات کا مسئلہ ہے وہ اس لیے شاعری نہیں کر رہے کہ غالب بھی شاعری کرتے تھے اور یہ کہ شاعری فنون لطیفہ میں سب سے ارجمند اور پر مایہ فن ہے۔

بنیادی طور پر جمال کا ذریعہ اظہار غزل ہے اس لیے وہ لمحہ لمحہ کلیت اور وحدت کی تلاش میں رہتا ہے۔ مجھے ایک خاص بات کا تجربہ ہوا جو قابل ذکر ہے۔ یہاں پہلے میں یہ کہہ دوں کہ اب سے سالہا سال پہلے تک جمال کو ایک ایسا شاعر سمجھتا تھا جو شاعری کو بظاہر خود غائیت سمجھتا ہے اور سماعت، سیاست اور تاریخ کے حساس مسائل سے اس کا کوئی سروکار نہیں اردو میں شاعروں کا موثر گروہ ایسا گزرا ہے جس نے شاعری میں انسانی مسائل کو موزوں بنانا ہمیشہ ایک غیر شاعرانہ عمل سمجھا۔ مجھے جمال بھی اپنے ایک خاص شاعرانہ طور میں اسی گروہ کا ایک فرد معلوم ہوتا تھا لیکن جب میں نے جمال کے کلام کا مطالعہ کیا تو اس نتیجہ تک پہنچا کہ جمال ان ''نامور'' شاعروں سے کہیں زیادہ سیاسی شعور رکھتا ہے جو عظیم الشان کہلاتے ہیں۔ ہر لمحہ سیاسی شعور کی اصطلاح کا ورد کرتے رہتے ہیں۔ جمال زبان و بیان کے معاملے میں بہت محتاط ہے۔ یہاں بھی میں ایک بات کہتا چلوں کہ ہمارے شاعروں کے ماحول میں زبان و بیان اور صحیح و غلط کی بات کرنا آؤٹ آف فیشن سمجھا جاتا ہے۔ جمال احسانی جمالیات کا قابل رشک شعور رکھتے ہیں اور اسے بڑی ہنرمندی کے ساتھ کام میں لاتے ہیں۔

(جون ایلیا)

----O----

جمال احسانی عہد حاضر کے نمائندہ غزل گو شاعر ہیں۔ انہیں جذبات نگاری میں خاص امتیاز حاصل ہے۔ ان کے اشعار روح و دل کی گہرائیوں میں اتر کر قاری کو اس طرح اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں کہ ان کے سحر سے نکلنا تقریباً ناممکن ہوتا ہے۔

۲۵ اور ۴۰ سال کے درمیان (یہ عمر کا بیان ہے سن کا نہیں) کے لکھنے والوں نے کراچی، لاہور، سرگودھا، بمبئی اور احمد آباد کی ادبی فضاؤں میں جو تازگی اور پرکاری کی رنگا رنگ دھنک تانی ہے جمال احسانی کی شاعری اس دھنک کا ایک رنگ ہے۔ دس سال پہلے میں ان کا ایک مصرعہ شہروں شہروں لیے پھرا کرتا تھا ''ایک جگہ تو گھوم کے رہ گئی ایڑی سیدھی پاؤں کی'' یہ کوئی عظیم مصرعہ نہیں، مگر انوکھا اور اچھوتا ہے۔ اس میں عصر بھی ہے اور عصر سے آگے جانے کا امکان بھی۔ اس میں زبان کے سفر کی کہانی بھی ہے یعنی یہ کہ اس قسم کا مصرعہ دیا شنکر نسیم اور قائم چاند پوری نہیں لکھ سکتے تھے۔ تب سے اب تک جمال احسانی نے عظیم شاعری تو پیدا نہیں کی مگر تازگی احساس اور ندرت زبان کا سفر جاری رکھا ہے اور مجھ جیسے لوگوں کو مایوس نہیں کیا ہے۔

(ساقی فاروقی)

----O----

آنگن آنگن شمع خیال یار جلے
رات آئی اور لوگ ستارہ وار جلے

میں نے لوگوں سے پوچھا کہ یہ کس کا شعر ہے؟ کسی نے کہا کہ بندہ نوجوان ہے اور روزی روٹی کے لیے عرب میں کسی جگہ جگہ صحرا کی خاک چھان رہا ہے۔ بات آئی گئی ہوئی اور اس کے بعد بھی جمال کے اشعار نظر سے گزرتے رہے۔ اس سے صاحب سلامت بلکہ بات اچھی خاصی شناسائی سے ہوتے ہوئے دوستی میں بدل گئے۔ اچانک ایک روز اس شعر

اس آنکھ میں ایک رنگ ہے اور رنگ ندامت
یہ ہار ہے اور ماننے والے کے لیے ہے

ساعت کا حصہ بنا' وہ دن ہے اور آج کا دن۔ میں نے جمال احسانی کو معاف نہیں کیا۔

(پروین شاکر)

(ستارہ سفر کی بزم رونمائی سے چند سطور)

----O----

ہر شاعر کی ایک امت ہوتی ہے جو اسے کھینچ کھینچ کر دھکے دے دے کر شہرت کے پل کو پار کرواتی ہے۔ جمال کو مشہور ہونے میں نہ کسی امت کی ضرورت پڑی نہ کسی پل کی۔ طبیعت شاعرانہ ہے' لا ابالی ہونے کے باوجود سنجیدہ شاعری کرتے ہیں۔ اپنے عہد کی شاعری سے آشنا ہیں۔ سچ بات یہ ہے کہ کسی دوست کے بارے میں لکھنا اتنا ہی مشکل کام ہے جتنا کسی رقیب کی تعریف کرنا۔ جمال کا نام بلاشبہ اردو کے شعری ادب میں ایک منفرد مقام رکھتا ہے۔

(انور مقصود)

----O----

''ستارہ سفر'' اور ''رات کے جاگے ہوئے'' کے بعد جمال احسانی کا تیسرا شعری مجموعہ ''تارے کو مہتاب کیا'' شائع ہو رہا ہے جس کی شاعری ابھی میری نظر سے نہیں گزری مگر جمال احسانی کی شناخت کے لیے دو مجموعے ہی کافی ہیں۔ کلاسیکی شاعری سے لگاؤ اور اس کے گہرے مطالعے سے جمال احسانی کے ہاں پختہ کاری بھی آئی اور شعری ذوق میں بھی نکھار آیا۔ اس کا کلام اس کے ہمعصروں نے بھی پسند کیا اور سینئر شعراء نے بھی۔ میرے نزدیک کسی شاعر کے لیے یہ اعزاز کی بات ہے کہ اس کا نام اس کے ہمعصروں کے ناموں کے کڑے انتخاب کی فہرست میں شامل ہو' جمال احسانی بھی اپنے منتخب ہمعصر شعراء کے دوش بدوش چلتا دکھائی دیتا ہے۔

(صابر ظفر)

----O----

مجھے پاکستان کے دو شاعر نصیر ترابی اور جمال احسانی بہت پسند ہیں۔ نصیر تو اکثر کہیں نہ کہیں مل جاتے

ہیں مگر جمال سے ملاقات صرف کراچی میں ہوتی ہے۔ میں جب بھی کراچی جاتا ہوں' کسی نہ کسی سے کہہ کر جمال احسانی سے ضرور ملتا ہوں تا کہ ان کی تازہ شاعری سن سکوں۔ ان کی شاعری کا اپنا الگ اسٹائل ہے۔

(جاوید اختر۔ بمبئی)

----O----

جمال کی شاعری اس بات کی تصدیق کرتی ہے کہ اس نے طویل سفر طے کیا ہے۔ ''ستارہ سفر'' سے ''رات کے جاگے ہوئے'' تک اور پھر بعد کی غزلوں میں کہیں ٹھہراؤ یا انجماد نہیں آتا۔

جمال نے کلاسیکی شاعری کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ اس کی ابتدائی تربیت احسان امروہوی جیسے استاد کے زیر سایہ ہوئی۔ اسے سلیم احمد اور قمر جمیل کا قرب بھی حاصل رہا ہے۔ اس طرح جمال احسانی نے غزل کی صنف کو مکمل روایتی انداز میں اپنایا۔ اس کا ڈکشن کلاسیکی روایت سے جنم لیتا ہے۔ البتہ مضامین میں اس دور کے مسائل کا شعور جھلکتا ہے۔ کلاسیکی روایت سے نہ صرف منسلک رہنا بلکہ ایسے الفاظ استعمال کرنا جو تقریباً متروک ہیں' جمال کو پسند ہے۔ اسے اس بات کا خدشہ نہیں کہ جدت پسند اسے روایت کے خانے میں ڈال کر نظر انداز کریں گے کیونکہ اسے معلوم ہے کہ وہ جو کچھ لکھ رہا ہے' اس میں احساس کی وہ رو بھی ساتھ چل رہی ہے جو اس کے ڈکشن پر حاوی آ جاتی ہے۔

(فاطمہ حسن)

----O----

جمال احسانی بیمار ہے تو کیا ہوا۔ اس نے اتنے بہت سے اچھے اشعار ''ستارہ سفر'' اور ''رات کے جاگے ہوئے'' کے ذریعے ہمیں دیے ہیں کہ ہماری جھولیاں بھر گئی ہیں۔ جمال کا کراچی سے اسلام آباد آ کر شدید بیمار ہو جانا ہماری بدنصیبی ہے۔ شاید اسی لیے ان دنوں پورا دارالخلافہ جمال کی دل داری و تیمارداری میں مصروف ہے۔

(اعتبار ساجد)

(روزنامہ پاکستان کے ایک کالم سے اقتباس)

----O----

جمال احسانی کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ وہ دوست زیادہ اچھا ہے یا شاعر۔ دوست کی ایک پہچان تو یہ بتائی گئی ہے کہ وہ پریشاں حالی اور درماندگی میں دوست کا ہاتھ تھام لے اور اچھے شاعر کی خوبی یہ کہ کسی بھی مشکل لمحے کو آسانی سے گزار دے اور آپ یہ کہہ اٹھیں کہ میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی مرے دل میں ہے۔ جمال کی دوستی اور شاعری دونوں میں یہ صفات بھرپور طریقے سے ملتی ہیں۔

(عقیل عباس جعفری)

----O----

محراب غزل میں چراغ جاں جلانے والوں میں ایک نام جمال احسانی کا بھی ہے۔ ایسا نام جسے اس صنف میں شامل ہوئے بہت مدت نہیں گزری تاہم جس نے غزل کی بساط پر شگفت رنگ میں اپنے شیوۂ گفتار کی بدولت شہرت پائی۔

(آصف فرخی)

----O----

شعر کہنے کے عمل کو دائرے کھینچنے اور ان میں سفر کرتے رہنے سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ میرے نزدیک شعر کہنے کا عمل مختلف سمتوں میں بیک وقت سفر کرنے کا نام ہے۔ ایسا سفر جس میں کوئی قدم اپنے ہی نقش قدم پر دوبارہ نہیں پڑتا بلکہ قدموں کا درمیانی فاصلہ بڑھتا رہتا ہے اور میرا خیال ہے کہ جمال احسانی کا درمیانی فاصلہ مسلسل بڑھتا جا رہا ہے۔

(عارف امام)

----O----

جمال احسانی کے ہاں ہر جذبہ اپنی پوری شدت کے ساتھ ملتا ہے۔ اس کی شاعری میں جو لینڈ اسکیپ بنتے ہیں ان میں کھلے پانی، وسیع صحرا، لمبا سفر، چلتی ہوائیں اور پھیلا آسمان پینٹ کیے گئی ہیں۔ کھلی کھلی فضائیں لیے ہوئے اس کے شعروں سے شاعر کی خوشی، اس کا ذہنی افق، اس کی امنگیں اور اس کے

خواب جھلکتے ہیں۔

(ریاض احمد شاد)

----O----

جمال احسانی سراپا شاعر ہیں۔انہوں نے نہ صرف اپنے ہمعصروں میں سے امتیازی مقام حاصل کیا بلکہ اپنے سینئرز اور جونیئرز کو بھی اپنی جانب متوجہ کیا۔ان کے شعری مجموعوں ''ستارہ سفر'' اور ''رات کے جاگے ہوئے'' کی پذیرائی جو اہل ادب کے ہاں ہوئی ہے' وہ سب کے سامنے ہے۔ان کا نیا شعری مجموعہ ''ستارے کو مہتاب کیا'' یقیناً ان کا اگلا پڑاؤ ہے اور ان کے قاری ایک دفعہ پھر ان کو پڑھنے کے لیے بیتاب ہیں۔میں یہ اس لیے کہہ رہا ہوں کہ میں بھی ان کے مداحوں میں سے ایک ہوں۔

(سعد اللہ شاہ)

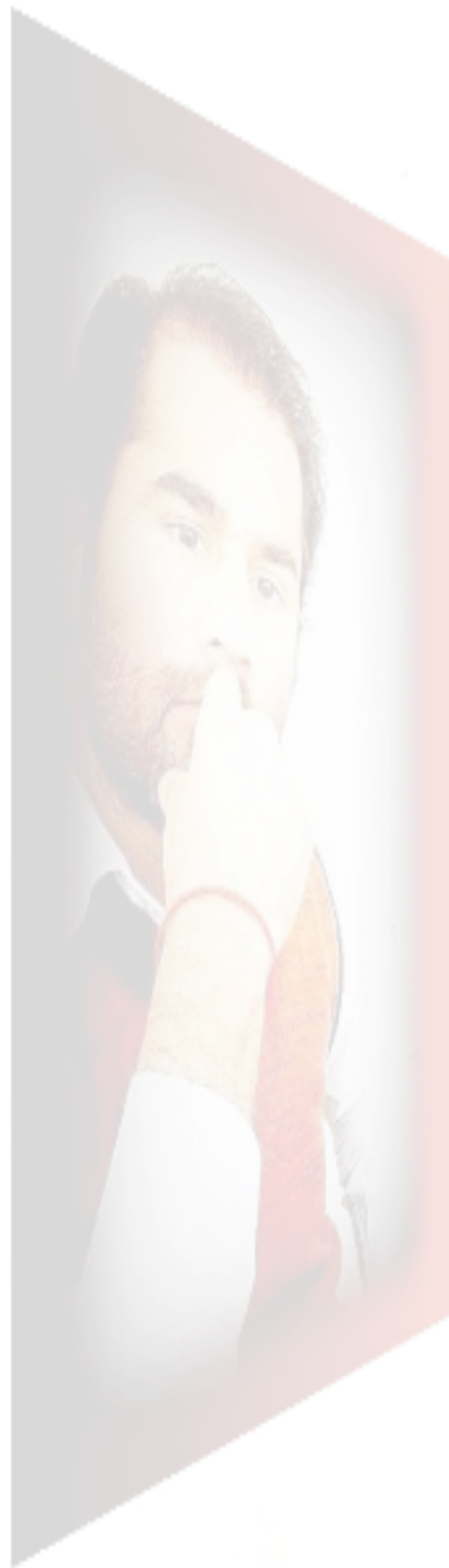
----O----

مجھے جمال بھائی کی شاعری سے کوئی دلچسپی نہیں۔وہ اگر غالب سے بڑے بھی ہوں تو میری صحت پر اس کا کیا اثر؟ میں تو اتنا جانتا ہوں کہ ان کی بیوی اور بچے ان سے سمجھوتا کر چکے ہیں' بچوں کے ساتھ ساتھ بھابھی بھی ان کی ہاں میں ہاں ملاتی ہیں۔سوچتا ہوں کہ اگر ان دونوں کی شادیاں الگ الگ ہوتیں تو دو گھر خراب ہوتے۔

میں نے اور اماں نے مل کر بھی جمال بھائی کو شاعری سے روکا مگر انہوں نے کبھی کسی گھر والے کی نہیں سنی۔اماں کا انتقال ہو گیا مگر جمال بھائی کی شاعری نہ گئی۔کوئی دوسرا بیٹا ہوتا تو مرحومہ سمجھ کر بات مان جاتا مگر پھر اسے جمال بھائی کون کہتا؟ میں نے انہیں کئی ایک دوسرے کاروباروں کے مشورے دیے۔ اپنے تعاون کا یقین دلایا۔ایک آدھ بار زبردستی ایک زمین کی ابتدائی قسط بھی بھری کہ آئندہ چل کر جناب اس پر اپنا گھر بنوالیں گے مگر یہ اسے بھی بیچ کر کھا گئے۔عمر میں مجھ سے دو سال بڑے ہیں' میں کمانے کی بات کرتا ہوں تو کہتے ہیں کہ تم سے کچھ مانگا تو نہیں ہے مگر مالی طور پر پریشان رہتے ہیں۔آمدنی کم اور اخراجات زیادہ۔کتابوں کو آگ لگا کر پیسہ کمانے کا ذکر کروں تو طنزیہ فرماتے ہیں ''برادرم تم ایک جاہل آدمی ہو' اپنے کام سے کام رکھو' جمال بھائی کا حکم سر آنکھوں پر مگر مجھ سے یہ برداشت نہیں ہوتا کہ میں تو

اپنے ذاتی گھر میں رہوں اور میرا بڑا بھائی کرائے کے مکانوں میں ادھر سے ادھر مارا مارا پھرے۔ کاش کوئی انہیں سمجھائے۔ اگر یہ ٹی اینڈ ٹی میں بھی ہوتے تو ماشاء اللہ اسسٹنٹ انجینئر ضرور بن جاتے پھر شاعری بھی اچھی لگتی اور ان کی کتابیں بھی۔ جانے خدا کو کیا منظور ہے۔

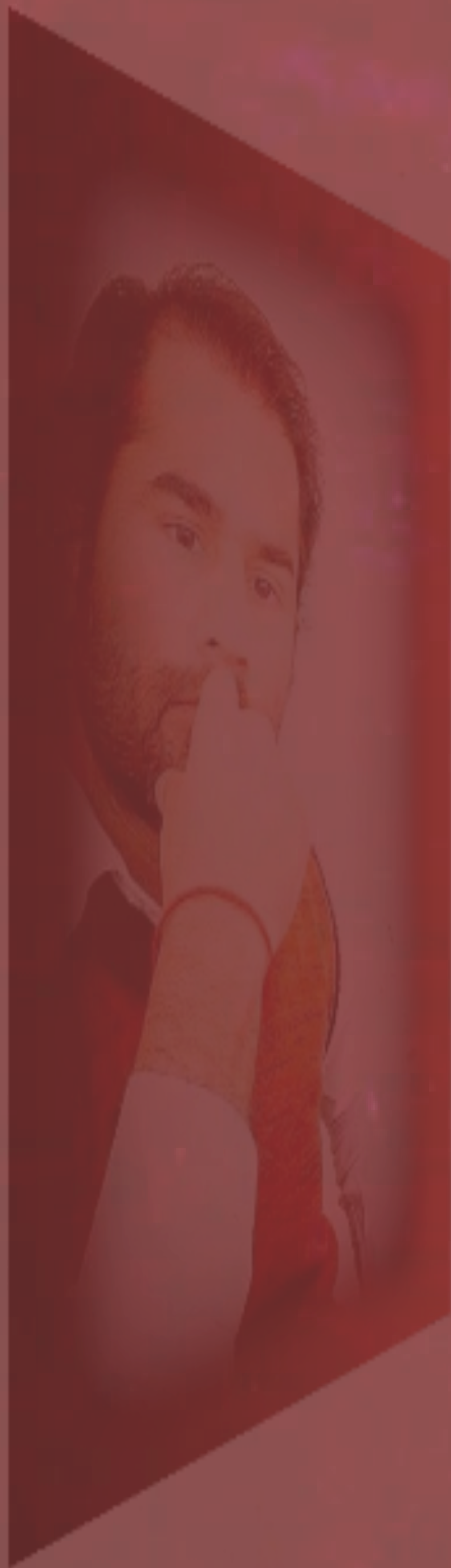
(چھوٹا بھائی..... محمد بلال عثمانی)





تیرا انجام ہوا جو، وہی ہونا تھا، جمالؔ
اس جہاں میں تُو کسی اور جہاں کا نکلا





نہ کوئی فال نکالی نہ استخارہ کیا
بس ایک صبح یونہی خلق سے کنارہ کیا

نکل پڑیں گے گھروں سے تمام سیّارے
اگر زمین نے ہلکا سا اِک اشارہ کیا

جو دل کے طاق میں تو نے چراغ رکھا تھا
نہ پُوچھ میں نے اسے کس طرح ستارہ کیا

پرائی آگ کو گھر میں اُٹھا کے لے آیا
یہ کام دل نے بغیر اُجرت و خسارہ کیا

عجب ہے تو کہ تجھے ہجر بھی گراں گزرا
اور ایک ہم کہ ترا وصل بھی گوارہ کیا

ہمیشہ ہاتھ رہا ہے جمالؔ آنکھوں پر
کبھی خیال کبھی خواب پر گزارہ کیا

ISBN: 978-969-496-304-4